معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰؍روپے فی شمارہ ۱۲؍روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰؍روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر (۲۵ / ۴۰)

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر (۹ / ۱۴)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۹ ماہ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۷ء عدد ۴

فہرست مضامین

ای میل : email : shibli_academy @ rediffmail.com

ویب سائٹ : http://Shibliacademy.blogspot.com

شذرات

ابتداً ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سندھ، گجرات اور بعض ساحلی مقامات میں ہوئی اور وہاں ان کی آمد کے ساتھ ہی اسلامی علوم خصوصاً علم حدیث کا چرچا ہونے لگا تھا لیکن شمالی ہند میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نے علم حدیث کا غلغلہ بلند کیا اور دہلی کو سلطنت و حکومت کی طرح اس کا بھی مرکز بنادیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کی بہ دولت دہلی سے بنگال تک حدیث نبوی کی گرم بازاری رہی، اس طرح اگیارہویں اور بارہویں صدی ہجری میں علم حدیث کا جو بیج اس سرزمین میں ڈالا گیا وہ تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں ایسا تناور اور سرسبز وشاداب درخت ہوگیا جس کے برگ وبار سے ہندوستان کا کوئی گوشہ خالی نہیں رہا، حضرت شاہ صاحبؒ کا خانہ ہمہ آفتاب تھا، خصوصاً ان کے فرزند اکبر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) کا فیض بہت عام وتام تھا، جن کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ (م ۱۲۶۲ھ) سے علم حدیث کے کئی سلسلے چلے گویا جس طرح دنیائے اسلام میں احادیث کی جمع وتدوین کے لئے تیسری صدی ہجری کا زمانہ سب سے زریں کہلاتا ہے، اسی طرح ہندوستان میں تیرہویں اور چودہویں صدی کا زمانہ علم حدیث کی جانب شدت اعتنا کے لئے مشہور ہے۔

علم حدیث کے تعلق سے ان صدیوں کی اہمیت کی بنا پر جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ نے مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی کے زیر اہتمام ۲۱-۲۲ / مارچ ۲۰۰۷ء کو "ہندوستان اور علم حدیث تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سمینار کرایا تھا، جامعہ اور مرکز الشیخ کے بانی اور سرپرست مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کا خاص موضوع علم حدیث ہے جس کا درس وہ ملک وبیرون ملک کے متعدد مدارس وجامعات میں برسوں دے چکے ہیں اور حدیث وشروح حدیث کی تحقیق وتحشیہ میں ان کی زندگی گزری ہے، اسی لئے انہوں نے سمینار کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اس کے لئے نمونتاً جو عنوانات تجویز کئے ان سے ان کی بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے، ایک دور افتادہ جگہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا اکٹھا ہونا ان کے غیر معمولی اثر ورسوخ اور کشش وجاذبیت کا نتیجہ ہے، مولانا سید محمد رابع ندوی اپنی تمام

تر مشغولیتوں کے باوجود اپنے کئی رفقا کے ساتھ تین روز یہاں مقیم رہے اور متحدہ عرب امارات کے شیخ محمد خزرجی بھی اپنے احباب کے ساتھ تشریف لائے، محدود ومتعین وقت کے باوجود ہر مقالہ نگار کو مقالہ پڑھنے کا موقع دیا جانا بھی مولانا کا اعجاز تھا، سمینار کی سب سے بڑی خوبی خوش انتظامی تھی جس کی وجہ سے تین روز تک یہ خطہ بقعۂ نور بنا رہا۔

اب سمینار جس کثرت سے ہو رہے ہیں اتنا ہی ان کا معیار گرتا جارہا ہے، مندوبین کی کثرت اور مقالوں کی زیادتی کو سمینار کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے، مدارس اور دینی درس گاہوں کے سمیناروں میں سارا زور اژدحام اور بھیڑ بھاڑ جمع کرنے پر دیا جاتا ہے اور کیفیت سے زیادہ کمیت پر توجہ دی جاتی ہے، مندوبین اور مقالہ نگاروں کے انتخاب میں کسی معیار اور اصول کو مدنظر نہیں رکھا جاتا، جامعہ اسلامیہ کے مرکز الشیخ کے زیر اہتمام ہونے والا یہ سمینار اس سے مستثنیٰ ہے گو اس کے بھی اکثر کم سن مقالہ نگاروں نے جامعہ کے سربراہ کی گائڈ لائن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور نہ اصل موضوع تیرہویں اور چودہویں صدی کی خصوصیات، اس کے سلسلے اور اہم خانوادے اور ان صدیوں میں ہونے والی اصلاحات، تبدیلیوں اور نئے انداز اور رجحانات وغیرہ کو زیر بحث لائے، اکثر مقالہ نگاروں نے اشخاص ورجال کو موضوع بحث بنایا لیکن ان کی خدمات وکمالاتِ حدیث سے تعرض نہیں کیا، پھر بھی بہت سے مقالے بھاری بھرکم اور سمینار کی کامیابی کے ضامن تھے۔

ہم معارف کے مقالہ نگاروں سے متعدد بار عرض کر چکے ہیں کہ وہ اس کے معیار کو برقرار رکھنے میں ہمارا تعاون کریں، اصل مراجع کو مدنظر رکھیں، ضمنی مآخذ کے حوالے نہ دیں، لوگ اصلاً تو اردو کتابیں پیش نظر رکھتے ہیں اور حوالے عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں کے دیتے ہیں، معارف میں قدیم علوم وفنون اور قدما کی امہات کتب پر ریویو اور مسلمانوں کے گزشتہ پرعظمت کارناموں سے متعلق مضامین ترجیحاً شائع کئے جاتے ہیں مگر نوجوان اور سہل پسند مقالہ نگار زمانہ حال کے غیر اہم لوگوں پر مضامین لکھ کر معارف میں شائع کرانے کے آرزومند ہوتے ہیں، مقالہ نگاروں سے اس کی بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مضامین خوش خط اور صاف لکھیں کیوں کہ کمپوزنگ اور تصحیح کرنے والوں کی استعداد بھی اچھی نہیں ہوتی، گزشتہ شمارے میں پروفیسر اجتبا ندوی کے مضمون میں صفحہ ۱۷۲

پر محمد اعلی تھانوی کے بجائے مولانا محمد اشرف علی تھانوی لکھ گیا ہے، ناظرین اس کی تصحیح کرلیں،
مضمون نگار عربی اور فارسی عبارتیں نقل کریں تو ان کے ترجمے بھی کردیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اب مسلمان بھی ایک قوم کے مانند ہوگئے ہیں اور ان میں مختلف گروہ، مختلف طبقے اور مختلف رنگ ونسل کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ہر ایک اپنے علاحدہ تشخص اور الگ وجود کو برقرار بھی رکھنا چاہتا ہے، ان کی الگ الگ جماعتیں اور تنظیمیں بن گئی ہیں جن کے جدا جدا ادارے، مدارس اور جامعات ہیں اور سب کا دعوی یہی ہے کہ وہ اپنے دین وملت کی خدمت اور قوم کی سربلندی کا سامان کررہا ہے لیکن انسانی طبائع کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ اپنی ہی رائے اور اپنے ہی نقطہ نظر کو صحیح اور درست سمجھتا ہے اور دوسروں کی رائے اور نظریات کو غلط اور باطل سمجھتا ہے، جس کے بعد ایک گروہ کی دوسرے گروہ سے کشمکش شروع ہوجاتی ہے اور تحزب وفرقہ آرائی کی ایسی گھناؤنی اور ناگوار شکل سامنے آتی ہے، جس کو ہم نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے انتشار و پراگندگی بلکہ دنیائے اسلام کی تباہی وبربادی کے دہانے پر پہنچ جانے کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، آخر مسلمان اپنی سادہ لوحی سے کب تک دوسروں کی عیاری اور سازش کا شکار ہوتے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری میرے مخلص اور عزیز دوست تھے، مجھے ان کے انتقال کی خبر بہت دیر سے ملی، وہ علی گڑہ مولانا آزاد لائبریری میں ڈپٹی لائبریرین تھے، وہاں جاتا تو مطلوبہ کتابیں فوراً حاضر کرتے اور چائے سے خاطر تواضع کرتے، اصرار کرکے گھر بلاتے اور پُرتکلف دعوت کرتے، خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر ہوکر وہ پٹنہ گئے تو اسے ترقی دینے کے لئے متعدد کام کئے اور کئی سمینار کرائے جن میں مجھے بھی مدعو کرتے، وہاں سے ریٹائر ہوکر علی گڑہ آئے تو مولانا حسین احمد مدنیؒ پر ایک سمینار کا پروگرام بنایا مگر وہ نہ ہوسکا، ضیاء الدین صاحب کو علم وادب سے بڑا شغف تھا اور وہ اچھے منتظم بھی تھے، کئی کتابیں لکھیں لیکن اشاریہ نگاری کی حیثیت سے انہوں نے اپنا خاص سکہ جمایا، وہ بڑے شریف، نیک طینت، خوش خلق اور مرنجاں مرنج شخص تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت نعیم عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆

مقالات

شریعتِ اسلامی محمدی کا آغاز وارتقاء

از:- پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی ☆

بعد کے زمانے میں دین وشریعت کی جو تشریح وتعبیر کی گئی ہے وہ قرآن مجید وسنت نبوی کی تصریح کے مطابق نہیں معلوم ہوتی، قرآن مجید اور حدیث وسنت میں شریعت دین ہی کا ایک جز ہے جب کہ بعد کی تعبیر میں شریعت کو دین سے خارج سمجھنے کا عنصر درآیا ہے، دین سے بالعموم آج کل صرف عقائد واخلاق مراد لئے جاتے ہیں جن سے شریعت کا کوئی خاص واسطہ نہیں سمجھا جاتا، شریعت کو صرف احکام تک محدود کردیا گیا ہے اور وہ بھی صرف ان احکام وامور وقوانین تک جو حلال وحرام کے خانوں میں بانٹے جاتے ہیں، اس طرح دین وشریعت کی دوئی قائم ہوگئی ہے اور اس نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور احکام اسلامی کی تشریح میں خاصا فساد پیدا کیا ہے، اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت اسلامی کا ازلی تسلسل ٹوٹ گیا اور شرائع اسلامی کی اقدار مشترکہ اور ان کا بنیادی توافق واشتراک نظر سے اوجھل ہوگیا، ایک غلط نظریہ یہ قائم ہوگیا کہ دین اسلام اپنے اصول دین کے لحاظ سے تو از حضرت آدم علیہ السلام تا حضرت سرور عالم ﷺ یکساں رہا مگر ان کی شریعتیں مختلف ہوتی گئیں اور اس اختلاف شرائع کی لے اتنی بلند ہوئی کہ اسلامی شرائع کی یکسانیت اور موافقت، اتحاد واشتراک کا خیال ہی مٹ سا گیا، اسی کے ساتھ دوسرے غلط خیالات اور خام نظریات بھی بہت زور وشور سے وجود میں آئے، ان میں سے ایک یہ تصور بہت عام ہے کہ شریعت محمدی اسلامی کی تشکیل وتعمیر مدنی دور نبوی (۶۲۲ء - ۶۳۲ء) کے دوران ہوئی

☆ سابق صدر شعبہ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑہ۔

اور مکی دور اسلامی (۶۱۰ء - ۶۲۲ء) دینی دور تھا مگر تشریعی زمانہ نہ تھا، اسی کا شاخسانہ یہ خیال باطل بھی ہے کہ اصل اسلامی احکام مدنی دور نبوی کے عطایا ہیں، مکی دور نبوی صرف دینی واخلاقی تعلیمات سے وابستہ تھا، ان میں احکام وقوانین نہیں آئے اور آئے بھی تو صرف برائے نام آئے، اسی سے ایک اور غلط فہمی یہ بھی وجود میں آئی کہ احکام وقوانین اور شرائع بنیادی طور سے حاکمیت کے زمانے میں جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں، مکی دور اسلام کی حاکمیت کا زمانہ نہ تھا لہذا صرف بنیادی دینی واخلاقی تعلیمات سے کام چلایا گیا، یہ تمام تصورات حقیقت کے خلاف ہیں۔

قرآنی شہادتیں

شریعت اسلامی محمدی کی نوعیت وحقیقت اور آغاز وارتقا، تعریف وتشریح پر سب سے محکم اور قطعی شہادتیں خود قرآن مجید کی آیات کریمہ دیتی ہیں، ان کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان سب کو ان کی ترتیب نزولی کے لحاظ سے جمع کرنا زیادہ مفید ہے، سورۂ شوریٰ مکی ہے اور ایک ترتیب نزولی کے اعتبار سے وہ باسٹھویں (۶۲) سورہ ہے یعنی اس سے پہلے اکسٹھ سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوچکی تھیں لیکن اس سے زیادہ اہم بات اس کا زمانہ نزول ہے، روایات شان نزول میں اس کا ذکر نہیں ملتا مگر مولانا مودودیؒ نے آیت کریمہ اور سورۂ کریمہ کے دور بست اور مضمون کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ وہ سورہ حٰم السجدہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی تھی اور سوہ حٰم السجدہ کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ "...... معتبر روایات کی رو سے اس کا زمانہ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے"، مولانا موصوفؒ نے سورہ حٰم السجدہ کے مقدمے میں ابن ہشام ۱/۳۱۳-۳۱۴، اور تفسیر ابن کثیر ۴/۹۰-۹۱، اور البدایہ والنہایہ ۳/۶۲ کے حوالے سے اپنی بات کو مستند بنایا ہے۔ (تفہیم القرآن ۴/۴۳۴-۴۳۵، نیز ماقبل صفحات، قرآن مجید کی سورتوں کی نزولی ترتیب کے لئے ملاحظہ ہو: قرآن مجید، شائع کردہ مدرسۃ الصفاء الاسلامیہ، ڈومریا گنج)

اب آیت کریمہ کا متن اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

"شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ...... الخ"۔

"راہ ڈال دی تم کو دین میں، وہی جو کہہ دیا نوح کو، اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور

جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔ (شاہ عبدالقادر دہلویؒ)

"اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ ٹھہرایا ہے جس (پر چلنے) کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا...... الخ"۔ (ڈپٹی نذیر احمد)

"راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو...... الخ"۔ (شیخ الہند، ترجمہ/ تفسیر: شبیر احمد عثمانیؒ)

"اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا...... الخ"۔ (مولانا اشرف علی تھانویؒ، بیان القرآن، ۱۰/۶۶)

"اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا...... الخ"۔ (مولانا مودودیؒ، تفہیم ۴/۴۸۶)

"اس نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی...... الخ"۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ، تدبر قرآن، ۷/۱۴۹)

"اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا...... الخ"۔ (مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، تاج کمپنی لاہور، ۶/۹۶۷)

"اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا (اور جس کے اختیار کرنے کا) نوح کو حکم دیا تھا...... الخ"۔ (مولانا فتح محمد جالندھری، روشن چراغ، ۳۹۱)

قرآن مجید کے مترجمین کرام بالخصوص اردو ترجمہ وترجمانی کرنے والوں نے آیت کریمہ میں صرف دین کے مقرر کرنے کی بات ہی تلاش کی ہے اور "شرع" کے فعل ماضی کا عام محاورہ میں "مقرر کرنا" ترجمہ کردیا ہے جو عربی زبان وادب اور قرآنی لغت سے میل نہیں کھاتا، لفظ "شرع" خاص معنوں میں آتا ہے اور اس کا مقرر کرنے سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ شریعت سے، ان گرامی قدر مترجمین میں سے بعض دیدۂ بینا رکھنے والوں نے اپنی تفسیر وترجمانی اور تشریح ومعنی آفرینی میں اصل بات بھی کہی ہے مگر ترجمہ میں اس کا لحاظ نہیں فرمایا، "شرع" کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے (مولانا مودودیؒ، ۴/۴۸۶)،

اردو کے ایک صاحب ذوق لغت نویس نے اس کے معنی ''قانون بنانا اور شریعت جاری کرنا'' لکھے ہیں (عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات) اور راستہ بنانے کے لئے وہ لفظ ''الطریق'' کے اضافہ کے بھی قائل ہیں، بہرحال لغوی معنی ہی میں قانون وشریعت بنانے کا مفہوم موجود ہے، طبری، قرطبی وغیرہ متعدد عرب مفسرین کرام نے لفظ شرع ہی استعمال کیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے دین کو عقائد تک محدود کر کے شریعت کے تفاوت کو بھی زیادہ ابھارا ہے (طبری، ۲۵/۲۰-۲۲؛ قرطبی، ۱۶/۱۲ ومابعد: ''و معنی شرع ای نہج و اوضح و تبین المسالک الخ'')۔

لفظ قرآنی اور عربی لغت کی رعایت کا انتہائی خوب صورت امتزاج حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ میں ملتا ہے:

''مقرر کرد برائے شما از آئین آنچہ امر کردہ بود باقامت آن نوح را، وآنچہ وحی فرستادیم بسوئے تو وآنچہ امر کردیم باقامت آں ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ را بایں مضمون کہ قائم کنید دین را ومتفرق نہ شوید دران...... الخ''۔(فتح الرحمان، ۵۸۲)

حضرت شاہؒ نے اپنے حاشیہ میں وضاحت فرمائی ہے کہ ''یعنی بسوئی حق حاصل آن است کہ انبیا در اصول دین متفق اند واختلاف شرائع در فروع است وبس، واللہ اعلم''۔

حکمت ولی اللّٰہی کا کرشمہ ہے کہ شروع آیت کریمہ میں پورے فقرے کا ترجمہ آئین کے مقرر کرنے سے کیا ہے اور اس میں دین کو آئین شریعت/شرع کی رعایت سے کہا ہے جب کہ دوسری جگہ آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں دین کا ترجمہ دین ہی کیا ہے کہ وہاں کامل دین کی اقامت مراد ہے، جس میں شریعت بھی شامل ہے، اس کا واضح اظہار حاشیہ فتح الرحمان سے ہوتا ہے، جس میں یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ اصول دین میں شرائع بھی شامل ہیں اور اختلاف شرائع صرف فروع میں ہے نہ کہ اصول شرائع اور اصول دین میں اور اصول دین اصول شرائع کو بھی حاوی ہے۔

اسی مکی سورۂ کریمہ کی ایک اور آیت مقدسہ اسی لفظ ومعنی کی حامل ہے، اگرچہ وہاں اثبات سے زیادہ نفی کی گئی ہے: '' اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ

يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ الخ۔(شوریٰ:۲۱)

''آیا کافران را شریکان ہستند کہ مقرر کردند برائے ایشاں از دین آنچہ نہ فرمودہ است آں را خدا...... الخ''۔(شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

''اور شریک ہیں جو راہ ڈالی ہے، انہوں نے ان کے واسطے دین کی؟ جس کا حکم نہیں دیا اللہ نے...... الخ''۔(شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شیخ الہند بتصرف)

مولانا تھانویؒ نے دین مقرر کرنے کا مفہوم لیا ہے جب کہ مولانا مودودیؒ نے وضاحت کی ہے کہ ''کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کردیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا؟''، مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اسے دین ٹھہرانے سے تعبیر کیا ہے، مولانا دریابادیؒ نے دین مقرر کردینے کا ترجمہ کرنے کے بعد حاشیہ میں دین میں بدعت نکالنے اور اس کے استیصال کی بات بھی کہی ہے، مولانا فتح محمد جالندھریؒ اور ڈپٹی نذیر احمدؒ وغیرہ کے ترجموں میں بھی رستہ ٹھہرانے کا ہی مفہوم ملتا ہے۔

ان تمام تراجم وتشریحات میں لفظ ''شرعوا'' کا صحیح معنی ومفہوم نہیں دیا گیا ہے سوائے ایک آدھ شرح کے، بہرحال قرآنی لفظ ''شرع'' اور ''شرعوا'' کا معنی ومطلب مختلف ہے اور اس میں شریعت کا مفہوم ضرور موجود ہے۔

متقدمین میں امام طبریؒ نے ''شرعوا'' کے معنی یہاں ابداع وایجاد کے لئے ہیں: ''...... ابتدعوا لهم من الدين مالم يبح الله لهم ابتداعه'' (۲۵/۲۷-۲۸)، امام قرطبیؒ نے لفظ شرعوا ہی استعمال کیا ہے مگر ذرا مختلف انداز سے: ''...... فهل لهم آلهة شرعوا لهم الشرك الذى لم ياذن به الله ؟...... الخ'' (۱۶/۱۹)، ان دونوں اماماں تفسیر نے عقیدہ توحید یا شرک تک اسے محدود کردیا ہے، امام ابن کثیرؒ نے بھی لفظ ''شرع'' ہی استعمال کیا ہے مگر اس میں دین وشریعت دونوں کو سمو دیا ہے: ...... بل يتبعون ما شرع لهم شياطينهم من الجن والانس من تحريم ما حرموا عليهم من البحيرة ...... قد اخترعوها فى جاهليتهم من التحليل والتحريم والعبادات الباطلة والاقوال الفاسدة ...... الخ (۴/۱۳۹)، بہرحال ان تمام تعبیرات قدما میں شریعت اور

شرع نافذ کرنے کا مفہوم ومعنی پوری طرح پایا جاتا ہے جو لغوی قرآنی متن کے مطابق ہے۔

سورۂ جاثیہ دوسری مکی سورت ہے، جس کی ترتیب نزولی سورۂ شوریٰ کے بعد ۶۵ مقرر کی گئی ہے (ڈومریا گنج)، مولانا مودودیؒ نے اگرچہ اس سورہ کا زمانہ نزول کسی معتبر روایت میں نہیں پایا مگر اس کے مضامین کی بنا پر اسے سورۂ دخان کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہونے کا ذکر کیا ہے اور دونوں کو توام سورتیں قرار دیا ہے اور ان دونوں سورتوں کو بعض دوسری سورتوں سمیت سورۂ شوریٰ کے زمانہ میں ہی نازل ہونے کی بات کہی ہے، بلکہ سورۂ شوریٰ سے سورۂ جاثیہ تک کی تمام سورتوں کا زمانہ نزول قریب قریب قرار دیا ہے، یہ پوری بحث مضامین آیات و سور اور داخلی شہادتوں پر استوار کی ہے۔ (تفہیم القرآن، ۴/۵۲۰-۵۸۴ وما بعد)

بہر حال سورۂ جاثیہ کی آیت کریمہ-۱۸ میں لفظ شریعت واضح طور سے بہ طور اسم آیا ہے بہ طور فعل نہیں لایا گیا: "ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"۔

"پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستے پر اس کام کے سو تو اسی پر چل اور نہ چل پاؤں پر نہ دانوں کے"۔ (شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شیخ الہندؒ)

"پھر (اے پیغمبر) ہم نے تم کو دین کی (ایک) شریعت (یعنی اسلام) سے لگا دیا ہے (تو تم) اسی ڈھرے پر چلے جاؤ......"۔ (ڈپٹی نذیر احمدؒ)

"پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جایئے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلئے"۔ (مولانا تھانویؒ)

"اس کے بعد اے نبی! ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے، لہذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"۔ (مولانا مودودیؒ)

"پھر ہم نے تم کو اللہ کی ایک واضح شریعت پر قائم کیا تو تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"۔ (مولانا اصلاحیؒ)

بعض دوسرے اردو انگریزی مترجمین نے ان ہی معانی ومفاہیم کو اپنے ترجموں میں پیش کیا ہے، علامہ عبداللہ یوسف علی نے ترجمہ لکھا ہے: On the Right Way of Religion کیا

ہے، اسی کا اردو مفہوم مولانا دریابادیؒ کے اردو ترجمہ میں ملتا ہے: "پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا......"۔

حضرت شاہؒ نے "راہ ظاہر از دین" ترجمہ کیا ہے جو خالص لغوی ہے اور اس پر کوئی حاشیہ وافادہ بھی نہیں تحریر کیا ہے۔

صرف ایک مدنی سورہ سورۂ مائدہ-۴۸ میں شریعت کی جگہ شرعت ومنہاج کے الفاظ لائے گئے ہیں: "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا"۔

"برائے ہر گروہے از شما مقرر ساختہ ایم شریعتی و راہے"۔ (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)۔

"ہر ایک کو تم میں دیا ہم نے ایک دستور اور راہ"۔ (شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شیخ الہندؒ)

دوسرے مترجمین نے بھی اسی قسم کے ترجمے کئے ہیں:

"تم میں سے ہر ایک کے لئے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی"۔ (مولانا تھانویؒ)

"تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی تھی"۔ (مولانا دریابادیؒ)

مولانا موصوف نے شرعۃ سے مراد "ہر نبی کی لائی ہوئی کتاب یا تعلیم مراد لی ہے اور منہاج اس پیمبر کا تعامل یا سنت ہے، گویا یہ بتادیا کہ کتاب وسنت کی دوگونہ نعمت قدیم موحد قوموں کے حصہ میں بھی ودیعت رہی ہے"، تفسیر کبیر کے حوالے سے شرعۃ سے شریعت اور منہاج سے کمالات شریعت مراد لینا بتایا ہے، ان تراجم میں معمولی لفظی فرق کے علاوہ اصل معنی شریعت ہی کے لئے گئے ہیں جو دین اسلام کا ایک لازمی حصہ ہے، اس پر مزید بحث بالخصوص ان تمام آیات کریمہ کے سیاق وسباق کے اعتبار سے آگے آتی ہے لیکن یہاں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ دین وشریعت کے لازم وملزوم ہونے کا تصور ان سب میں موجود ہے اور تمام انبیائے کرام کے دین اور ان کی شرائع میں بھی وہ پایا جاتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور بعض دوسرے مفسرین وشارحین کرام نے بھی اسی مضمون کو اپنے اپنے حواشی میں بیان فرمایا ہے اور مولانا مودودیؒ نے سورۃ الشوریٰ میں اس پر مفصل بحث کر کے تمام جہات ومعانی کی تنقیح کردی ہے، اس پر مزید بحث ہوگی۔

ایک نکتہ اگرچہ اوپر کی تشریحات وحواشی میں آتا ہے مگر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کو اسی آیت کریمہ کے حاشیہ میں مزید وضاحت سے پیش کیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ دین اسلام بھی

ایک ہے اور اس کی شریعت بھی یکساں اور ایک ہے، اصول شرائع اور اصول دین سے اس کی تعبیر کی گئی ہے اور اسے امام ابن کثیر وغیرہ کے الفاظ میں اصل الدین اور اصل الشریعۃ بھی کہا جاسکتا ہے، اس کا محوری مقصد یہ ہے کہ جس طرح تمام انبیائے کرام کا دین ایک ہے اسی طرح ان کی شریعت بھی ایک ہے، اختلافِ شرائع کا جو ذکر آتا ہے وہ محض فروع میں ہے اور یہ اختلافِ فروع بھی اصل شریعت میں نہیں ہے بلکہ اقوام وملل انبیا کے احوال کی رعایت سے ہے، مولانا عثمانیؒ نے اسی کو یوں بیان کیا ہے کہ ”...... شرائعِ سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت واستعداد پر مبنی ہے، ورنہ مبدأ فیاض میں کوئی اختلاف وتعدد نہیں، سب شرائع ادیان سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے“۔

شریعت اسلامی کا تسلسل قرآنی شہادتوں سے بلاشبہ یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اسلام بہ طور دین بھی ایک ہے اور بہ طور شریعت بھی ایک ہے، ان دونوں میں اصول کی یکسانیت ملتی ہے اور بیشتر فروع بھی یکساں ہی ہیں، تمام اسلامی ادیان وشرائع کی تاریخ بتاتی ہے کہ اصولِ دین کے ساتھ ساتھ اصولِ شریعت بھی نازل ہوتے رہے اور وہ دونوں مل کر دین اسلام کی تعمیر وتشکیل کرتے رہے تھے، مکی آیات کریمہ سورۂ شوریٰ: (۱۸ و ۲۱) اور سورۂ جاثیہ: (۱۸) بلاکسی شک و شبہ کے شریعت اسلامی کی وضاحت کرتی ہیں، اب رہی مدنی سورۂ مائدہ کی آیت کریمہ ۴۸ تو اس کا نزول ضرور مدنی دور میں ہوا مگر اس کا حکم خالص مکی بلکہ اس سے بھی قبل کا ہے، اس آیت کریمہ کا سیاق اور سابقہ آیات کریمہ سے اس کا تعلق وربط اس حقیقت واقعہ کو سامنے لاتا ہے، اس پر مختصر سی بحث ذیل میں کی جاتی ہے:

اگرچہ آیت شریعت کا ربط گذشتہ آیات کریمہ میں سے غالباً سورتِ مقدسہ کے شروع سے ملتا ہے تاہم وہ آیت کریمہ ۴۲ سے واضح تر ہوتا چلا جاتا ہے، رسول اکرم ﷺ کو اہل کتاب بالخصوص یہود کے معاملات میں عدل وحکمت کے ساتھ فیصلے فرمانے کا حکم دیا جاتا ہے لیکن اگلی آیت کریمہ ۴۳ میں یہ مزاج یہود بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تورات کی موجودگی کے سبب آپ ﷺ کو حکم نہیں بنانے کے، پھر اگلی آیت کریمہ ۴۴ میں تورات میں حکم پر مشتمل وحادی ہدایت ونور کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق بعد کے تمام انبیائے کرام، صالح یہودی مشائخ وعلما اور دوسرے

نِ شریعت فیصلے کرتے رہے اور ان کی حقانیت پر گواہی بھی دیتے رہے اور ان کے مطابق فیصلے اور احکام نہ دینے والے افراد وطبقات کو کافر قرار دیا گیا، آیت کریمہ ۴۵ میں خاص قصاص کے احکام اتارے گئے جو بنیادی طور سے تورات میں مذکور تھے کہ نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں (جروح) کا قصاص مقرر کیا گیا اور ان کے مطابق حکم نہ دینے والوں کو ظالموں میں سے قرار دیا گیا، اگلی آیت کریمہ ۴۶ میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کو ان پیشرووں کے پیچھے بھیجا گیا اور وہ تورات کی تصدیق کرتے تھے اور ان کو عطا کردہ کتابِ الٰہی، انجیل بھی اسی کی تصدیق ہے لہذا اہل انجیل کو اپنی کتاب کے مطابق حکم دینے کا حکم دیا گیا اور آخری آیت گذشتہ ۴۷ میں رسول اکرم ﷺ اپنی کتاب منزل کے مطابق فیصلے فرمانے کا حکم ملا اور وہ بھی تورات وانجیل کی مصدق اور ان کے احکام شریعت کی حامل کتاب ہے۔

اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت اسلامی خالص ایک اور یکساں ہے اور اس میں تسلسل ہے، اصل شریعت اسلامی اصل دین اسلام کی طرح اولین نبی مکرمؑ کو عطا فرمائی گئی تھی اور ان کے زمانے سے بعد کے زمانے کے ہر نبی مکرمؑ کو دین کی مانند عطا کی جاتی رہی، سورۂ مائدہ ۴۸ کی حد تک تو شریعت اسلامی کا اتحاد صرف تورات وانجیل کے حاملین کرام کے زمانوں میں نظر آتا ہے اور وہ اس اتحاد کے ساتھ ساتھ تسلسل شریعت ودین کا بھی جلوۂ حق دکھاتا جاتا ہے، مکی آیات مذکورہ بالا سے حضرت نوحؑ کے عصر مبارک سے رسول اکرم اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے عہد میمون تک اتحاد وتسلسل کا واقعہ ملتا ہے، تقریباً تمام مترجمین، شارحین اور مفسرین کرام نے اس نکتۂ آغازِ شریعت ودین کا ذکر کیا ہے، حضرت نوحؑ سے آغاز کرنے کی حکمت بھی یہ بتائی ہے کہ حضرت آدمؑ کے بعد وہی نبی دین وشریعت اسلامی تھے، اس سے زیادہ اہم نکتہ حکمت کلامِ الٰہی میں یہ موجود ہے کہ اسی دین وشریعت کی وصیت اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ کو خاص طور سے کی تھی، حضرت نوحؑ کے بعد حضرات انبیائے ثلاثہ کے ذکرِ خیر کی حکمت یہ ہے کہ ان ہی تینوں رسولوں کی شریعت ودین کے ماننے والے اس وقت وعصر نزول میں بھی تھے اور بعد میں بھی، انہیں کے پیروانِ شریعت اصل دین وشریعت کے حاملین رہے، عرب جاہلی اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے دین و

شریعت کا پیرو بتاتے تھے اور ان کے دعوا میں حقیقت ثابتہ موجود تھی، یہودی حضرت موسیٰؑ اور ان کی کتاب الٰہی تورات کے پیرو تھے اور عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور ان کی کتاب انجیل کے، ان تینوں میں ایک اور نقطہ اتحاد یہ بھی تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دین وشریعت کو اصل مانتے تھے اور ابراہیمی ہونے پر فخر کرتے تھے، حضرت ابراہیمؑ سے اوپر ان کو اتفاق نہ رہا جو ان کی گم راہی، ضلالت اور کج روی کی علامت وشہادت ہی تھی لیکن حضرت ابراہیمؑ کو وہ اپنے دین وشریعت کا اصل ماخذ ومنبع اور سرچشمہ سمجھتے اور قرار دیتے تھے، اس طرح نزول قرآن کریم بالخصوص ان آیات شریعت ودین کے وقت تین مذاہب کے پیروؤں کا اتفاق تھا اور اسی سلسلہ اتفاق کی رعایت سے قرآن مجید نے ان کو رسول اکرم ﷺ کے دین وشریعت کی پیروی کا حکم دیا تھا کیوں کہ وہ نہ تو کوئی نیا دین تھا اور نہ ہی کوئی نئی شریعت، وہ تو وہی شریعت ودین ابراہیمی تھا جو ان کے بعد حضرات موسیٰؑ وعیسیٰؑ کو ملا تھا اور اب وہ اصل وآخر وارث کو پہنچا تھا۔

دین ابراہیمی اور شریعت محمدی کا ارتباط مکی عہد نبوی کو بجا طور سے دو الگ الگ زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: قبل بعثت کا دور اول جو چالیس سالہ زمانے (۵۷۱ء-۶۱۰ء) کو محیط ہے اور بعثت کے بعد کا دور دوم جو تیرہ سالہ نبوی زندگی (۶۱۰ء-۶۲۲ء) کا احاطہ کرتا ہے، دوسری مختلف حیثیتوں کے علاوہ تشریعی اور شریعت اسلامی کے اعتبار سے بھی یہ تقسیم صحیح ہے اور اہم، قبل بعثت کے دور کے بارے میں بعض علما ومفکرین اور فقہا ومحدثین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اس دور میں آپ ﷺ کس شریعت کے مطابق دینی اعمال بالخصوص تحنث وتعبد کے افعال انجام دیتے تھے؟ اس فکر وسوال کی دو جہات ملتی ہیں۔

ایک جہت تو قبل بعثت کی حیات طیبہ کے بارے میں بالخصوص اور عرب جاہلی کے باب میں بالعموم گومگو اور ابہام کا شکار ہے، وہ اسے خالص جاہلیت جاہلی اور بے شریعت و طریقت کا زمانہ سمجھتے ہیں جب شرک کا غلبہ اور دین حق کا قطعی فقدان تھا، اس فکر وتوجیہ نے یہ غلط نتیجہ نکال لیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ بھی جاہلی عربوں بالخصوص جاہلی قریش کے دین وشریعت کے پابند تھے، اس نقطہ نظر کی غلطی یا کوتاہی یہ ہے کہ ان مفکرین گرامی نے جاہلی قریش کے دین و شریعت کا سراغ نہیں لگایا اور نہ ہی کوئی تحقیق کی، جاہلیت کا ان پر اتنا غلبہ اور ان کی فکریں اس کا

اتنا نفوذ ہوا کہ وہ شرک اور مشرکانہ رسوم ہی کو دین وشریعت سمجھ بیٹھے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ شوریٰ کی مذکورہ بالا آیات کریمہ کی تفاسیر نیز کتب سیرت وتاریخ کے ابواب، ایام جاہلیت)

دوسری جہت نے یہ فکری پروبال نکالے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے عہد کے دو آسمانی مذاہب- یہودیت ونصرانیت کے رسوم عبادات اور اصول دین وشریعت سے کسب فیض کیا، کیونکہ صرف وہی دو ماخذ تھے جو توحید وآخرت وغیرہ کا تصور دیتے تھے اور انہیں کے دم سے دین و شریعت اسلامی کا کچھ بھرم قائم تھا، اگرچہ وہ بھی انحرافات وبدعات میں مبتلا ہو چکے تھے، اس فکر کی بنیادی غلطی وہی ہے جو جاہلی قریش کے دین وشریعت کے باب میں در آئی ہے کہ یہودیت و نصرانیت کے اصلی ماخذ کی تحقیق نہ کی گئی اور رسول اکرم ﷺ پر خاص کر اور عربوں-قریش مکہ پر عام طور سے ان کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے جو ضروری اور ناگزیر تھا۔

ان دونوں جہات کی غلطی اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمی کا ازالہ بہ خوبی اسلامی دین و شریعت کی آفاقیت وتسلسل کے مطالعہ سے کیا جاسکتا تھا، جب یہ سب کو تسلیم ہے کہ حضرت آدمؑ کے عہد اولین سے لے کر حضرت سید المرسلین وخاتم النبیین ﷺ کے عہد آخرین تک تمام "ادیان وشرائع انبیائے کرام" میں اصول دین وشریعت یکساں رہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ تمام بنیادی اور آفاقی احکام وتعلیمات بھی سب میں یکساں رہیں اور وہ تمام انبیائے کرام کے ذریعہ ان کی امتوں کو ملیں اور ان کے ذریعہ بعد کی نسلوں تک پہنچیں، بعد کے لوگوں نے مختلف وجوہ سے انحرافات وخرافات اپنائے جن کا دین وشریعت سے کوئی واسطہ نہ تھا، ان کی حیثیت صاف و شفاف دریا کے حیات بخش پانی کی سطح پر گندگی پیدا کرنے والے خس وخاشاک کی تھی، امتوں کے علما وصلحا اور دوسرے صالح طبقات وافراد نے اصل اور خرافات میں ہمیشہ فرق وامتیاز کیا۔

مدتوں کے بعد جب اقوام اور ملل انبیا پر شریا شرک وخرافات کا غلبہ ہوگیا اور دین وشریعت اس کے نیچے دب کر رہ گئے اور مجدد دین دین وشریعت کے بس سے معاملہ آگے نکل گیا تو نئے انبیا اور رسولانِ عظام کی بعثت مقدر ہوئی، نئے رسولوں کی بعثت وآمد اور ان کے کام کا بنیادی فریضہ اور نہادی مقصد دین وشریعت کی تطہیر اور خیر کی غلبہ آفرینی ہی تھی، وہ کوئی نئی شریعت اور کوئی نیا دین لے کر نہیں آتے تھے، وہ واحد واکلوتی شریعت اسلامی اور خالص وربانی دین کو غالب کرنے

کے لئے تشریف لاتے تھے، وہ اصل دین وشریعت کے باقیات صالحات کو جاری وساری رہنے دیتے اور انحرافات وبدعات کو دور کردیتے تھے، تسلسل شریعت اسلامی اور تسلسل دین اسلام کی حقیقت اور حکمت کو قدیم ترین علما و محدثین نے بہ خوبی سمجھا اور سمجھایا تھا، متاخرین میں سے متعدد معرفت شناس اور حق آگاہ علما و مفکرین نے اپنی حکیمانہ بصیرت اور مومنانہ فراست سے اس کا ادراک کرلیا، ان میں سرفہرست حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں اور جن لوگوں کی نظر حکمت قرآنی اور فہم حدیث پر گہری نہیں تھی صرف وہی بے بصیرتی کا شکار ہوئے۔

عہد جاہلی میں دین حنیفی

جاہلی عربوں اور مکہ مکرمہ کے قریشیوں کے دین وشریعت کا تجزیہ صحیح اسلامی پس منظر میں کیا جاتا، جیسا کہ حضرت شاہؒ نے کیا یا دوسرے بالغ نظر و مفکرین واہل علم نے اس کا احساس وادراک کیا، تو معلوم ہوتا کہ ان کا دین وشریعت ابراہیمی - اسماعیلی تھا، اسی کو حدیث شریف میں "الدين الحنيفية السمحة السهلة" اور "دین حنیفی" کہا گیا ہے اور قرآن مجید نے ملت ابراہیمی وغیرہ سے تعبیر کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی فہم وبصیرت سے اسی میں خوب صورت اور واقعی اضافہ کرکے اسے "ابراہیمی - اسماعیلی دین حنیف" قرار دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دین وشریعت کی وراثت ان کے فرزند اکبر حضرت اسماعیل ذبیح اللہؑ کے توسط سے عربوں میں آئی تھی جس طرح ملت ودین ابراہیمی حضرت اسحاقؑ کے ذریعہ بنو اسرائیل میں نسل بعد نسل پہنچتی اور منتقل ہوتی رہی، دین موسیٰؑ اور شریعت عیسیٰؑ جو انحرافات وخرافات کے سبب یہودیت وعیسائیت میں ڈھل گئے، اصلاً دین ابراہیمی اسحاقی پر استوار تھے، دین ابراہیمی کی دوشاخوں - اسماعیلی واسحاقی نے بہرحال اصل دین وشریعت کو رواج واعتبار دیا تھا، اسی سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح عہد نبوی میں یہود ونصاریٰ میں اصل دین وشریعت اسلامی کی باقیات صالحات موجود تھیں، اسی طرح یا کسی فروتر درجے میں جاہلی عربوں اور بالخصوص قریش مکہ میں اصل دین وشریعت ابراہیمی واسماعیلی کی باقیات صالحات رواج پذیر تھیں، اب رہا شرک وکفر اور مشرکانہ رسوم وعبادات اور کافرانہ وملحدانہ افکار ومعتقدات کا معاملہ تو عربوں کی طرح اس زمانے کے یہود ونصاریٰ کے متعدد افراد وطبقات بھی ان میں مبتلا تھے ورنہ یہود میں حضرت عزیرؑ اور نصاریٰ میں حضرت عیسیٰؑ کی ابنیت اور رب الارباب کے ساتھ احبار ورہبان کی خدائی کا ذکر

قرآن مجید دوسرے انحرافات وخرافات کے ساتھ ہرگز نہ فرماتا، حضرت شاہ صاحبؒ نے بہرحال عربوں کو حاملان دین وشریعت ابراہیمی واسماعیلی ثابت کیا ہے اور ان کی تحقیق سے انکار کرنا ناممکن ہے، کیوں کہ وہ قرآنی شہادتوں، حدیثی ثبوتوں اور تاریخی شواہد پر استوار ہے، حضرت شاہؒ کی مذکورہ بالا فصل ان سب کی جامع ہے۔

مکی شواہد کا مطالعہ

عربوں میں بالخصوص قریش مکہ میں دین وشریعت ابراہیمی کے تسلسل و اجرا کے باب میں روایات سیرت وتاریخ اور احادیث نبوی کا صحیح مطالعہ اور نتیجہ خیز تجزیہ نہیں کیا گیا، ورنہ ان کے دین وشریعت کے اصل ونقل دونوں کا پکا ثبوت فراہم ہوجاتا، اس سے زیادہ لاعلمی کا باعث بلکہ گمرہی کا عامل یہ وطیرہ رہا کہ مکی سورتوں کا اور ان میں موجود احکام وتعلیمات کا تجزیہ نہیں ہوا، نہ جانے یہ خیال کیسے مستولی وغالب رہا کہ مکی سورتوں میں احکام وشریعت کا بیان ہی نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اخلاقی تعلیمات ہیں، اسی "فکر غلطاں" نے دین وشریعت کی دوئی اور ثنویت کا نظریہ وخیال پیدا کیا اور اس نے مکی دور میں شریعت اسلامی کا فقدان پایا، ظاہر ہے کہ جب وہ نبوی زندگی کے دوسرے دور اسلامی میں دین وشریعت کے اصول وفروع کا سراغ نہیں لگا سکے تو قبل بعثت کی حیات طیبہ اور جاہلی دور قریش میں دین وشریعت ابراہیمی کا سراغ و اجرا کیوں کر پاسکتے تھے!

راقم اپنے بعض مضامین میں اس کی وضاحت کرچکا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے کافی پہلے سے عربوں میں حنیفیت کی تحریک چلی آرہی تھی، مختصراً یہاں صرف یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کے صالح وارثوں کے بعد جب عربوں میں انحرافات شروع ہوئے تو مختلف اوقات اور متعدد مقامات میں کئی افراد اور طبقات اصل دین وشریعت کی تبلیغ واشاعت اور عمل واجرا کی کوششیں کرتے رہے، اجداد رسول اکرم ﷺ میں کئی پشتوں اوپر ایک ایسے مجدد دین جناب ابوکبشہ تھے اور ان کے معاصرین میں اور بعد میں تو احناف کے مختلف طبقات وجود میں آگئے تھے، اس تحریک حنیفیت کا خاص زور رسول اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ سے قریب کے زمانے میں رہا تھا، ان سب کا ایک ہی نعرہ اور ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ اصل دین حنیفی ابراہیمی کی طرف لوٹا جائے اور دین وشریعت اسلامی کو قائم کیا جائے، وہ اپنی فہم وفراست اور وجدان و

رجحان کے مطابق صحیح دین حنیفی پر عمل کرنے کی مساعی کرتے رہے مگر ان کو صحیح ہدایت دینے والا کوئی نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنے قلب خالص اور وجدان روحانی سے مبہم ہدایات پاتے تھے اور علمائے یہود ونصاریٰ ان کو اپنے مذہب کی طرف لے جاتے بھی جو اصل دین ابراہیمی کی مسخ شدہ صورتیں تھیں۔

قبل بعثت کی شریعت اسلامی

قبل نبوت کے طویل تر اور تعمیر کردار وشخصیت کے دور میں رسول اکرم ﷺ کے فکر وعمل کا معاملہ بالکل الگ تھا، عام عربوں اور قریش مکہ کے دین حنیفی کے اصول واحکام نے رسول اکرم ﷺ کو بچپن سے ایک خاص مذہبی وشرعی نظام سے متعارف کیا تھا، قریشی آبا واجداد میں سے صالح افراد وطبقات بالخصوص جناب ابوکبشہ اور جناب عبدالمطلب ہاشمی نے اصل ونقل کا فرق سمجھایا تھا، احناف عرب بالخصوص احناف قریش نے بعد کے زمانے میں رسول اکرم ﷺ کو مشرکانہ خیالات ورسوم سے پرہیز کرنے کا گر سکھایا، حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدویؓ اور حضرت ورقہ بن نوفل اسدیؓ رسول اکرم ﷺ کے پیشرو معاصر حنیف تھے اور ان کے افکار وخیالات نے فکر نبوی کی تطہیر میں دنیاوی طور سے کافی اہم حصہ لیا تھا، سیرت نبوی کے روایات وواقعات اس کی پکی شہادت دیتے ہیں، خود رسول اکرم ﷺ کی فکری نشو ونما اور فطری صالحیت نے آپ ﷺ کو قبل بعثت زمانے میں دین حنیف کے قریب تر کر دیا تھا۔

حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ کی نبوت وبعثت اور رسالت کا فیصلہ یوں تو تقدیر الٰہی میں ازل سے طے ہو چکا تھا، تاہم آپ ﷺ کی ولادت کے بعد اس عالم ناسوت اور جہان اسباب میں تعمیر شخصیت اور تطہیر کردار کا ایک الوہی نظام بروئے کار آیا، محققین علما ومحدثین کا اجماع ہے کہ نبی ورسول بننے والے شخص عظیم کی حفاظت وصیانت کا سلسلہ ولادت کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے، اسے اصطلاحی عصمت انبیا کا نظام وطریقہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ بعد نبوت وبعثت کا کارگرد کارساز وکارفرما طریقہ ہے مگر وہ ہے اسی کا ایک ابتدائی نظام جو ہونے والے رسول اکرم ﷺ کے کردار کی حفاظت کرتا اور اس کو فروتر چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قبل بعثت لڑکپن ہی سے رسول اکرم ﷺ کے قلب وروح اور جسم وبدن اور کردار وشخصیت کا تزکیہ شروع کر دیا گیا، حضرت حلیمہ سعدیہ کے گھر پانچ سال کی عمر مبارک میں شق صدر اور تطہیر وتزکیۂ قلب کا واقعہ،

گیارہ بارہ سال کی عمر شریف میں عریانی سے بچانے کی ملکوتی ترکیب اور فرشتوں سے امداد وتائید، نوجوانی میں لہو ولعب اور موسیقی وغیرہ سے حفاظت وغیرہ کی الوہی اور آسمانی ہدایت، جوانی میں شرک اور رسوم مشرکانہ سے اجتناب کی ربانی ودیعت وغیرہ اور خالص دین حنیفی کی پابندی اور تحنث وغیرہ کی عادت چند مثالیں ہیں۔

مکی عہد نبوی کی شریعت

مکی دور نبوی کے روز اول ہی سے جب نبوت ورسالت سے سرفراز ہوئے، آپ ﷺ پیغمبر آخر الزماں بنے جس طرح آپ ﷺ کو دین اسلام کا آخری، عالمی اور ابدی اور کامل ترین مذہب عطا ہوا اسی طرح آپ ﷺ کو آخری شریعت بھی ملی، دین اسلام کا جو تعلق ورشتہ سابق انبیائے کرامؑ کے ادیانِ اسلامی سے رہا تھا وہی شریعت محمدی کا ارتباط وربط سابقہ شرائع اسلامی سے تھا، گذشتہ رسولان عظامؑ کے دین وشریعت کے بنیادی اصول واحکام بھی آپ ﷺ کو عطا فرمائے گئے تھے اور بہت سی فروع میں بھی اشتراک وتوافق تھا، ان میں سے صرف ان شرائع اور فروع کو تبدیل کیا گیا تھا جو گذشتہ ادوارِ رسالت میں زمان ومکان کے جبر اور اس کے تقاضوں کے تحت اور ان کے حاملین اور علم برداروں کے اقتضا واستطاعت کی بنا پر مقامی اور ترقی پذیر رہ گئی تھیں، دین وشریعت محمدی کی آفاقیت، حمیت اور ابدیت کے عناصر نے کامل ترین دین وشریعت کی حسین ترین اور انتہائی فطری اور مفید ترین صورت گری کی تھی کیوں کہ اسی دین وشریعت محمدی کو تا قیامِ قیامت باقی اور کارفرما رہنا تھا، گذشتہ تمام شرائع اسلامی کی بنیادی چیزیں شریعت محمدی کا جز بن گئی تھیں اور ان کے درمیان اختلاف سے زیادہ توافق کا عنصر تھا۔

تمام اصول دین اور سارے اصول شرائع میں اتحاد واشتراک اور بیشتر فروع دین وشریعت میں بھی توافق وتطابق کی حقیقت اسلام کے دین وشریعت کے تدریجی ارتقا کے الٰہی اصول سے بہتر طور سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وہی بنیادی ربانی قانونِ ارتقا ہے، جس طرح یہ پوری کائنات اور دوسری روحانی کائنات میں تدریجی ارتقا کا قانون ربانی کارفرما رہا، اسی طرح کارِ نبوت میں بھی وہ کارگر رہا، خود ادارۂ نبوت ہزار ہا رسولوں اور ان گنت نبیوں کے پے بہ پے اور مختلف مقامات وادوار میں آنے سے ترقی پذیر ہوتا رہا اور گذشتہ دور کی نبوی میراث جانشین عہد کے حاملین دین واسلام کو عطا ہوتی رہی اور یکے بعد دیگرے رسولوں نے عمارت نبوت کی تعمیر میں حصہ لیا، رسول اکرم ﷺ

نے پیغمبر آخر الزماں کی حیثیت سے اس عمارت میں آخری اینٹ لگا کر اس کی آخری تکمیل و تزئین فرمادی۔

گذشتہ شرائع اسلامی سے شریعت محمدی اسلامی کی نسبت وربط پر مولانا مودودیؒ نے سورۂ شوریٰ:۱۸ کی تفسیر میں ایک حقیقت افروز بحث لکھی ہے جس کو مزید تائید کے لئے یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا، مولانا موصوفؒ کی اس نادر وقیمتی بحث میں دین وشریعت کے باہمی ناگزیر ارتباط کی حقیقت بھی واضح کی گئی ہے جس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ ان دونوں کے باہمی تعلق کے باب میں خاصی غلط فہمی راہ پاگئی ہے، دوسرے قرآنی اصطلاحات اور تعبیرات پر بحث بھی شان دار ہے جو حکمت قرآنی کو سامنے لاتی ہے اور اسی سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے:

"فرمایا کہ "شرع لکم" "مقرر کیا تمہارے لئے"، شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے، عربی زبان میں اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی (Legislation) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (Law) اور شارع کا لفظ واضع قانون (Lawgiver) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے، یہ تشریع خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے، ان اصولی حقائق کا جو قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے...... اس لئے لامحالہ وہی حق رکھتا ہے کہ انسان کے لئے قانون وضابطہ بنائے اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون وضابطہ دے، چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کردیا:

"......اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے اس کی نوعیت آئین کی ہے...... اس بنا پر اللہ کے مقرر کئے ہوئے اس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ...... یہ بندوں کے لئے ان کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے......"۔

......دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کو دی گئی تھی اور اسی کی ہدایت اب محمد ﷺ کو دی گئی"، اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے...... وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ایک شخص کو اپنا رسول

مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے......

تیسرے یہ کہ اللہ کی سیادت وحاکمیت ماننے کے ساتھ ان لوگوں کی رسالت کو ماننا جن کے ذریعہ یہ تشریع بھیجی گئی ہے اور اس کو وحی تسلیم کرنا، جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اس دین کا لازمی جز ہے اور عقل ومنطق کا تقاضا بھی یہی ہے......

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیا کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ "اقیموا الدین......" اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی اور انبیاؑ ان دونوں کاموں پر مامور تھے......

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں: ایک یہ کہ دین کو قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ خود دین سے کیا مراد ہے؟ جسے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا......

......انبیاؑ کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں، تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کرلیں بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کرلیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے، تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے......

اب دوسرے سوال کو لیجئے: بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاؑ کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً، اس لئے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام وضوابط نہیں ہیں بلکہ صرف توحید وآخرت اور کتاب ونبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا ہے یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے......

"قرآن مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے،

ان میں حسب ذیل چیزیں ہمیں ملتی ہیں: (۱) (سورۃ البینۃ-۵) ''سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں حالاں کہ ان دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں...... لیکن اختلاف شرائع (نماز کی شکل وہیئت، اجزا، رکعات، قبلہ، اوقات اور دوسرے احکام، نصاب زکوٰۃ اور شرحیں) کے باوجود اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے''۔

(۲) (المائدہ-۳) میں مردار اور خون، سور کے گوشت اور دوسرے جانوروں کے حرام طریقوں سے ذبح یا موت کو حرام قرار دیا گیا ہے)، اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکام شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) (التوبہ-۳) سے معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال وحرام کے ان احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے دیے ہیں۔

(۴) (النور-۲: زنا کی حد اور سورۂ یوسف-۷۶: چور کی گرفتاری)'' ...... اس سے معلوم ہوا کہ فوج داری قانون بھی دین ہے، یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زنا، سود خواری، قتل مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا وغیرہ) اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عمل قوم لوطؑ اور لین دین میں قوم شعیبؑ کا رویہ) ان کا سد باب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہئے، اسی طرح وہ احکام شریعت بھی دین کا حصہ ہونے چاہئیں جن کی خلاف ورزی کو خلود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے، مثلاً میراث کے احکام (النساء-۱۴)، اسی طرح جن چیزوں کی حرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدت اور قطعیت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً ماں بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حرمت، چوری کی حرمت، جوئے کی حرمت، جھوٹی شہادت کی حرمت...... علی ہذا القیاس، جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، ان کی اقامت کو بھی محض اس بہانے اقامت دین سے خارج نہیں کیا جاسکتا کہ رمضان کے تیس روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے اور کعبے کا حج تو صرف اس شریعت میں تھا جو اولاد ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی''۔

'' دراصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ آیت '' لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ...... '' کا الٹا مطلب لے کر اسے یہ معنی پہنا دیئے گئے، اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اس امت کے لئے دین تھی اور اس کے دور میں اس کی اقامت مطلوب تھی...... رہا ان شریعتوں کا اختلاف تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے، مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھئے، نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزا میں بھی فرق تھا، اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر رمضان کے تیس روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے ...... ان ہی دو مثالوں پر دوسرے احکام شریعت کو بھی قیاس کر لیجئے۔

مولانا موصوف کا اگلا بیان خاصا معرض بحث رہا ہے مگر شریعت اسلامی کے اعتبار سے وہ ایک حقیقت ثابتہ ہی ہے، '' قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے بلکہ یہ اعلانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے ...... اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے، مکی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کے غلبہ واقتدار کا تھا...... (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن ۲/ ۶۳۳-۶۳۸؛ ۳/ ۶۶۵-۶۶۷ اور ۷۳۰-۷۳۲؛ ۴/ الصافات آیات ۱۷۱ تا ۱۷۹، حواشی ۹۳ و ۹۴، ص، دیباچہ اور آیت ۱۱ مع حاشیہ)۔

مولانا مودودیؒ نے اس بحث میں بھی اور اگلی بحث بابت تعمیر ریاست اسلامی میں بھی مدنی احکام وآیات سے کافی استدلال کیا ہے، ان کے پیش نظر کامل وجامع ترین دین وشریعت محمدی ہے جو مکی دور سے ارتقا پذیر ہو کر مدنی دور میں مکمل ہوئی۔ (تفہیم القرآن ۴/ ۴۸۶-۴۹۳)

ہمارے استدلال کا سارا زور مکی دور نبوی پر ہے، لہٰذا مدنی دور کے احکام دین وشریعت سے یہاں بحث نہیں ہے، مولانا موصوفؒ کے مذکورہ بالا طویل ومدلل مباحثہ کے بعد اس پر مکی دور میں تعمیر وتشکیل اور ارتقائے شریعت کے لحاظ سے چند اضافے ناگزیر ہیں، ان میں اسلامی احکام

شریعت کا مکی آغاز اصل نکتہ بحث ہے کہ مکی دور نبوی سے شریعت محمدی کی تعمیر شروع ہوئی پھر اسی دور میں اس میں ارتقا ہوا جو مدنی دور میں بھی جاری رہا اور آخر میں کامل ہوا، مختلف احکام دین و شریعت کا مکی سورتوں کی آیات کریمہ کے حوالے سے ارتقا کا ذکر اس سلسلہ میں ناگزیر ہو جاتا ہے جس پر مختصر بحث ہی کی جاسکتی ہے کہ اصل و کامل بحث تحقیقی مطالعہ کا حصہ ہے۔

مکی دور میں اسلامی محمدی شریعت کی ابتدا

سورۂ شوریٰ: ۱۸-۲۱؛ اور اس سے زیادہ سورۂ جاثیہ: ۱۸ نے ثابت کردیا کہ شریعت اسلامی محمدی رسول اکرم ﷺ کو خالص مکی دور میں ہی عطا کردی گئی تھی اور زمانہ اس کا - نزول سورہ کا - اگرچہ سنہ پانچ نبوی (۶۱۵ء) ہے، تاہم اس کا آغاز رسالت محمدی کے ساتھ ہی ہوا تھا کیوں کہ احکام دین و شریعت اسی کے ساتھ عطا ہونے شروع ہوگئے تھے، اس نقطۂ زمان تک پوری وضاحت اور کامل صراحت آگئی کہ رسول اکرم ﷺ کو ایک خاص شریعت پر استوار کردیا گیا ہے، جواب خالص محمدی شریعت ہے اور اس کا ابراہیمی - اسماعیلی شریعت سے واسطہ ضرور ہے مگر وہ اب اس پر مبنی نہیں ہے۔

ہمارے تمام قدیم و جدید مفسرین و شارحین نے نہ سہی مگر تمام صاحب نظر اہل علم نے سورۂ جاثیہ -۱۸ کی بنیاد پر شریعت اسلامی محمدی کے نفاذ اور اس کے لازمی اتباع کا اظہار اپنی اپنی تفاسیر میں کیا ہے، امام المفسرین طبریؒ نے اس شریعت کے نفاذ و اتباع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''...... فاتبع تلک الشریعة التی جعلنا ھا لک'' پھر دو اکابر تفسیر حضرات قتادہؒ اور ابن زیدؒ کی آرا نقل کی ہیں جو بالترتیب یہ ہیں: ''الشریعة : الفرائض و الحدود والامر والنھی / الشریعة : الدین''، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ فرائض و حدود اور امر و نہی وغیرہ دین ہی کا ایک لازمی جز ہیں جیسا کہ ذکر آچکا ہے۔ (تفسیر الطبری: ۲۵/ ۱۷۲؛)

امام قرطبیؒ نے آیت کریمہ میں وارد لفظ شریعت کے مختلف معانی نقل کیے ہیں، ان میں حضرات قتادہؒ و ابن زیدؒ کے مذکورہ بالا اقوال کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ، کلبیؒ اور ابن العربیؒ کے اقوال نقل کرنے کے بعد ان کا اجماعی معنی و مفہوم نکالا ہے کہ دین کے اس طریقہ پر آپ ﷺ کو ہم نے گامزن کیا جو ملت اسلام ہے: ''ثم جعلناک علی طریقة من الدین وھی ملة الاسلام''، اس کے بعد وہ کانٹے کی بات کہی جو شرائع کے اختلاف کی حقیقت کھولتی ہے کہ توحید،

مکارم اور مصالح کے باب میں تمام شرائع کے درمیان کوئی اختلاف نہیں صرف ان فروع میں اختلاف کیا ہے، جن کو علم الٰہی نے ضروری سمجھا: ''ولا خلاف ان اللہ تعالی لم یغایر بین الشرائع فی التوحید والمکارم والمصالح وانما خالف بینھما فی الفروع جسما علمه سبحانه''، ایک دوسرے معنی کو امام ابن العربیؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے قبل تمام انبیا اور ان کی امتوں کی بھی شرائع ملی تھیں اور جو ان کا انکار اس آیت کریمہ کی بنا پر کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں بہرحال ہم اس کے بھی منکر نہیں ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کی امت کو ایک خاص منفرد شریعت دی گئی ہے'' قال ابن العربی : ظن بعض من یتکلم فی العلم ان ھذہ الآیة دلیل علی ان شرع من قبلنا لیس بشرع لنا ؛ لأن اللہ تعالی افرد النبی ﷺ و امته فی ھذہ الآیة بشریعة ، ولا ننکر ان النبی ﷺ و امته منفردان بشریعة ...... '' الخ (۱۶/ ۱۴۲)، اس تشریح و تعبیر کے مطابق سابقہ اسلامی شرائع کے بہت سے احکام و امور ملت اسلامی اور شریعت محمدی کے بھی احکام و امور ہیں اور ان کی تعمیل ضروری ہے جس طرح رسول اکرم نے مکی و مدنی دونوں ادوار میں ان کی پیروی بھی کی تھی سوائے اس کے کہ وہ منسوخ ہوگئے ہوں۔

صاحب کشاف امام زمخشریؒ نے سورۂ شوریٰ : ۱۳ کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے وہی حرف بہ حرف امام قرطبیؒ کی عبارت میں ملتا ہے، جہاں تک ''شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ'' کی تفسیر و معنی کا تعلق ہے، بعد میں دونوں کی تفسیروں میں کچھ نئی اور الگ چیزیں بھی ہیں (۴/ ۲۱۹) لیکن سورۂ جاثیہ : ۱۸ میں صاحب کشاف کی تفسیر بہت مختصر ہے، البتہ وہ اسے شریعت ہی قرار دیتے ہیں: ''علی شریعة ''علی طریقة و منھاج ''من الامر ''من امر الدین ، فاتبع شریعتک الثابتة بالدلائل والحجج ...... ''امام زمخشریؒ نے لا علم / جہال سے مراد رؤسائے قریش کو مراد لے کر بہرحال اشارہ دیا ہے کہ یہ شریعت محمدی مکی دور کی تھی۔ (۴/ ۲۹۲)

امام رازیؒ کی تفسیر کبیر میں سورۂ جاثیہ کی آیت کریمہ کی مختصر تشریح ہونے کے علاوہ وہ کشاف کی عبارت کی خالص بازگشت معلوم ہوتی ہے، شریعت اور جہال کی تعریف و تفسیر بالکل وہی

ہے جو کشاف میں ہے، البتہ کلبیؒ کے حوالے سے یہ اضافہ ہے کہ قریشی رؤسا نے رسول اکرم ﷺ سے جب مکہ مکرمہ میں اپنے آبا کی ملت کی طرف لوٹنے کو کہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی "قال الکلبی: ان رؤساء قریش قالوا للنبی ﷺ وهو بمكة: ارجع الى ملة آبائك فهم كانوا افضل منك واسن، فانزل الله تعالى هذه الآية"۔ (۲۷۵/۲۷)

تمام کتب تفسیر اور امامانِ تاویل کا استقصا مقصود نہیں ہے، صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ قدیم مفسروں میں سے بیشتر نے شریعت اسلامی محمدی کا یہی معروف مطلب لیا ہے، البتہ حافظ ابن کثیرؒ جیسے بعض مفسرین کی تفسیر آیت کریمہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ تشنہ بھی، سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ انہوں نے اس سے مراد وحی الٰہی لیا ہے: "ای اتبع ما اوحی الیک من ربک لا الہ الا ھو واعرض عن المشرکین"۔ (۱۸۹/۴؛ نیز ۴/۷/۱۳، سورۂ شوریٰ: ۱۳ کا بھی وہی معاملہ ہے اور اس میں شرائع اور مناہج کے اختلاف کا ذکر کرکے بات مزید الجھادی ہے)

بعض دوسرے اردو مترجمین وشارحین کا اوپر ذکر آچکا ہے اور ان کا شریعت محمدی اسلامی کے بارے میں وہی روایتی خیال ہے، البتہ مولانا تھانویؒ وغیرہ نے اس سے مراد شریعت اصطلاحی ہی لی ہے اور اسے صرف روایتی دین تک محدود نہیں رکھا ہے، حتی کہ مسائل سلوک کے تحت یہ بھی وضاحت کی ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ کو اتباع شریعت کا حکم ہے تو پیروں اور صوفیوں کو کیسے اس سے بالاتر سمجھا جاسکتا ہے، وہ بھی شریعت کی پابندی پر مجبور ہیں، مولانا دریابادیؒ نے حضرت مرشدؒ کے اس قول کو نقل کیا ہے، اگرچہ ان کے بیان آیت میں شریعت سے زیادہ دین کا روایتی تصور موجود ہے، بہرحال شریعت کا اقرار ان کو بھی ہے۔

ان تمام تفسیری بیانات سے چند بنیادی حقائق کا اظہار ہوتا ہے جن کو بہ طور نکات ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱- سورۂ شوریٰ: ۱۳- اور سورۂ جاثیہ: ۱۸- کے تحت لفظ شریعت مکی دور کے آغاز میں ہی قرآن مجید میں نازل ہو چکا تھا، وہ دین وشریعت کے اجتماع اور ان دونوں کے لازم وملزوم

معنی میں ہے اور اس سے کامل وجامع دین وشریعت محمدی ہے۔

۲- دوسری مکی سورتوں اور ان کی آیات احکام سے شریعت محمدی کی صورت گری کی جاسکتی ہے۔

۳- شریعت محمدی دوسری اسلامی شرائع کی ترقی یافتہ اور جامع ترین شکل تھی اور وہ تمام اصول وفروع میں منفرد تھی۔

۴- دوسری گذشتہ شریعتوں میں بھی اصول دین اور اصول شریعت مشترک تھے اور صرف بعض فروع میں اختلاف تھا جو اختلاف سے زیادہ تنوع کہا جانا چاہیے، وہ بہرحال متضاد و متصادم نہیں تھیں، یہی ان کی حقیقت تنوع کو ثابت کرتی ہے۔

۵- شریعت محمدی گذشتہ اسلامی شرائع سے تمام اصول دین وشریعت میں متفق ہے، صرفَ بعض جزئیات اور فروع میں رنگارنگی، تنوع یا انفرادیت رکھتی ہے۔

۶- مکی دور سے شریعت محمدی خالص بن گئی اور ملت ابراہیمی اور شریعت اسماعیلی کی جامع تر صورت اختیار کرگئی تھی۔

۷- وقت اور مکان کے تقاضوں کے ساتھ مکی محمدی شریعت کا ارتقا ہوتا رہا اور وہ نبوی دور کے آخر تک کامل ترین بن گئی۔

ہندوستان میں عربی ادبیات

از:- پروفیسر محمد اجتبا ندوی ☆

(۲)

تاریخ، سوانح اور جغرافیہ

تاریخ، سوانح اور جغرافیہ سے متعلق بھی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن کی تعداد ۱۵ ہے، ان میں سے چند بہت اہم ہیں:

شیخ زین الدین مخدوم معبری کی تصنیف تحفۃ المجاہدین، اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے جو مالابار (کیرالہ) میں پرتگالی سامراج کے خلاف تحریک آزادی کی تاریخ ہے، یہ جنگ ۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸ء سے ۹۸۹ھ/ ۱۵۷۱ء تک ہوئی، اس ضمن میں عہد قدیم سے مولف کے زمانے تک کی کیرالہ کی تاریخ بھی آگئی ہے، اس پوری تحریک کو محمد بن عبدالعزیز کالی کٹی نے ۵۰۳ اشعار میں منظوم بیان کردیا ہے جس کا عنوان ہے: الفتح المبین للسامر الذی یحب المسلمین ، اس کا تذکرہ پروفیسر ویران محی الدین نے اپنی کتاب الشعر العربی فی کیرالا میں بھی کیا ہے۔

عبداللہ محمد بن عمر النہروالی نے تاریخ گجرات لکھی جو مظفری سلاطین اور اس کے بعد کے گجراتی حکمرانوں کی تاریخ ہے، وہ دسویں اور گیارہویں صدی میں تھے، وقائع کی اہم کتاب: محی الدین العیدروس نے النور السافر عن اخبار القرن العاشر لکھی جو دسویں صدی ہجری کے وقائع پر مشتمل ہے، سیرت نبوی سے متعلق دو کتابیں اہم ہیں: ایک تو شیخ محی الدین عیدروس مذکور کی اتحاف الخضرۃ العزیزۃ لعیون السیرۃ الوجیزۃ ، دوسری اور کرامت علی کی السیرۃ المحمدیۃ ہے جو اپنے دور کے لحاظ سے سیرت پر اچھی اور ضخیم تصنیف

☆ المرکز العلمی، مصطفےٰ منزل، گلی نمبر ایونیو، اے ۳۰/۱، بٹکونہ پارک، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ہے، اس کی تعریف میں مولانا عباس چریاکوٹی نے ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر پیش ہے:

لا تعجبوا ان علا کتب الذین مضوا　　فان للخمر معنی لیس فی العنب

سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء) (۱۲۰۰ھ/ ۱۸۸۵ء) کا پہلے ذکر آچکا ہے، یہ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے جو ممتاز و عظیم ادیب، شاعر اور عالم و مورخ کے قلم سے ہے، ڈاکٹر فضل الرحمان گنوری[1] نے ۱۹۷۶ء میں اس کی تحقیق کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، رسالہ کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے (یہ پہلی کتاب ہے جس میں علمائے ہند کے حالات اور ہند میں عربی زبان اور عربی علوم کا تذکرہ ہے جس سے آئندہ کام کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کردی ہے)، خود مولف نے اپنی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: اس جیسی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، اس کی تو توفیق اللہ تعالیٰ نے اپنے عاجز متوکل بندۂ غلام علی حسینی واسطی بلگرامی کو عطا کی اور اس میں جو کچھ عظیم تفسیروں، مقدس حدیثوں میں ہندوستان کے بارے میں وارد ہوا، ان سب کو جمع کردیا ہے، اس میں چار فصلیں ہیں:

۱- تفسیر و حدیث میں درج تذکرہ ہند۔

۲- علما کا تذکرہ، اللہ ان کے دلائل کو روشن کرے۔

۳- حسن کلام اور شان دار جملے و تحریریں۔

۴- عشاق و معشوقات کا بیان و سراپا۔

آزاد قادر الکلام شاعر بھی تھے اور ان کے دواوین سبع سیارہ کے نام سے مشہور ہیں۔(۱)

اس مبحث کو ختم کرتے ہوئے یہ تحریر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس عظیم ملک میں آغاز اسلام سے انگریزی سامراج تک مختلف و متنوع دور گذرے ہیں جن میں منزل بہ منزل علوم و فنون ترقی پذیر ہوتے رہے اور ہر فن میں جو علما و مفکرین ادبا و اصحاب قلم گزرے ہیں، اتنے اسلامی ممالک میں بھی نہیں گزرے، عرب، ایران اور خراسان کے فضلا اور دانش وروں کے مقابلے میں ان کا اسلوب بیان اور طرز نگارش مختلف ہوسکتا ہے لیکن ابداع اور ذہانت و نکتہ رسی

[1] معارف: مقالہ نگار کو تسامح ہوا ہے، یہ ڈاکٹر فضل الرحمان گنوری نہیں ڈاکٹر فضل الرحمان سیوانی ندوی ہیں۔

میں سرزمین ہند کا حصہ کم نہیں ہے۔

نحو، لغت، بلاغت و ادب

ہم اب زبان عربی سے متعلق نحو، لغت، بلاغت اور نثر و شعر کے سرسبز و شاداب چمن کا رخ کرتے ہیں۔

ادبیات عرب کے معاون (آلیات) میں نحو، لغت اور بلاغت بھی ہیں جن کو ڈاکٹر زبید احمد نے (علم اللسان) کا عنوان دیا ہے مگر اس کا مفہوم اب وہ نہیں رہا، ہم پہلے ہی یہ واضح کرچکے ہیں کہ ہندوستان میں یہ تمام علوم و فنون دین کے زیر سایہ دینی مقاصد کے لئے پروان چڑھے اور دینی رجحان ادب کے مفہوم میں غالب رہا، اسی بنا پر یہاں کے عربی ادب میں کوئی (بے ادبی) درنہ پاسکی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کئی ادبی رجحانات نظر نہیں آتے۔

علم نحو ایک اہم موضوع ہے اور اس سے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری تک کی چار بہت اہم نحوی کتابیں یہ ہیں، جار اللہ زمخشری کی ''مفصل'' ابن حاجب کی ''کافیہ''، ابن مالک کی ''الفیہ'' اور ابن ہشام کی ''مغنی اللبیب، شذور الذھب وشرح شذور الذھب''، جن کی ستائش علامہ ابن خلدون نے بلند الفاظ میں کی، تاہم عربی زبان میں علمائے ہند نے بھی کچھ اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

محمد بن ابوبکر الدمامینی نے تعلیق الفرائد کے نام سے ابن مالک کی تصیف تحصیل الفرائد و تکمیل المقاصد کی شرح کی ہے، دمامینی اصلاً مصری تھے مگر آخر عمر میں ہندوستان آگئے تھے اور گجرات میں قیام کے دوران یہ کتاب لکھی تھی، اس کے علاوہ ایک معیاری کتاب ارشاد النحو شہاب الدین دولت آبادی نے لکھی جو کافیہ سے بہتر ہے مگر اس کتاب کو وہ شہرت نہیں ملی، ممتاز عالم عبدالحکیم سیال کوٹی نے شرح جامی کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا۔

عربی لغت کے سلسلہ میں ہندوستانی علما کا حصہ خاصا نمایاں ہے، ابتداً یہاں رضی الدین حسن الصغانی نے العباب الزاخر اور کتاب الاضداد ترتیب دی، کتاب الاضداد مختصر سا رسالہ ہے، اس میں عربی الفاظ کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ متضاد معنی رکھتے ہیں مثلاً بیع کے معنی خرید و فروخت دونوں کے ہیں، مجدالدین فیروز آبادی کی قاموس ہندی تصنیف

اس لئے شمار کی جاتی ہے کہ مجدالدین دوبار فیروز شاہ تغلق اور محمود شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، اس کی شرح ہندوستان کے لائق صد افتخار فرزند، مردم خیز قصبہ بلگرام کے باشندہ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سعادت مند شاگرد اور عالمی شہرت رکھنے والے علامہ سید مرتضٰی زبیدی (۱۱۴۵ھ/ ۱۸۳۲ء) تاج العروس کے نام سے لکھی اور اس نے تمام عربی دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، یہ آج تک اصحاب علم کا مرجع ہے، علامہ موصوف ہندوستان سے یمن کے شہر زبید چلے گئے تھے، وہاں عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر میں جاکر آباد ہوگئے اور زبیدی کی نسبت سے مشہور ہوئے، اس دور کے بادشاہوں نے ان کی بڑی قدر افزائی کی، علما، ادبا اور عوام میں بھی مقبول ہوئے، مصر میں ہی ۱۲۰۵ھ میں وفات پائی اور وہاں ہی دفن کئے گئے، احیاء العلوم کی شرح اور دوسری کتابیں تصنیف کیں، ان پر مضامین، مقالات اور تحقیقی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اردو میں محترمہ ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری، ریڈر کرامت گرلز کالج لکھنؤ نے مفید و معیاری کتاب لکھی، دور حاضر کے ممتاز ادیب استاذ علی الطنطاوی لکھتے ہیں:

''علما کے درمیان زبیدی کی شخصیت عجیب و نادر تھی، وہ ایک ایسے عالم تھے جنہوں نے مشیخت ''مسند استاذ'' کو تجارت کا رنگ دے دیا اور ایک باوقار دولت مند عالم کی تصویر پیش کی، ان کی عظمت اس بلندی کو چھوگئی جس سے وہ اپنے زمانہ کے مشہور علما میں شمار کئے گئے، عوام، خواص، بادشاہ، نواب سب کی نظر میں باعزت ہوئے، دوسرے علما اس سے بہت ہی کم احترام حاصل کرسکے، انہیں ہر علم و فن سے بہرہ وافر ملا تھا، لغت، حدیث و تاریخ میں امامت کا درجہ حاصل تھا، وہ ادیب و شاعر اور باوقار و بارعب مسکراتے ہوئے چہرہ مہرہ والے تھے، وقار و رعب کے ساتھ دل چسپ اور باغ و بہار شخص تھے اور لطیفوں اور چٹکلوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے''۔(۲)

ہندوستان میں قاموس کی اور بھی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں مفتی سعد اللہ مراد آبادی کی ''القول المانوس فی صفات القاموس''، مفصل اور لائق استفادہ ہے، مولانا محمد اعلیٰ تھانویؒ کی عظیم لغت ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کا ذکر پہلے ہوچکا ہے، ۱۱۵۶ھ میں اس کی تکمیل کی گئی اگرچہ یہ فنی لغت ہے مگر اس موضوع پر بے نظیر ہے، لغت و عروض پر ہندی تصانیف میں امیر خسرو

کی ''اعجاز خسروی'' کا امتیازی درجہ ہے اگرچہ کتاب فارسی میں ہے مگر مثالیں عربی میں ہیں اور صنعت و اعجاز میں لاثانی ہے، انہیں ''سعدی ہند'' کا خطاب بھی دیا گیا، ان کے معتبر سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا ہے:

''انگریزی کی ایک مثل کے مطابق یہ صحیح ہے کہ ''تنوع کمال کے منافی ہے''، لیکن یہ مثل عام قابلیت اور اوسط درجہ کی استعداد رکھنے والے انسانوں پر ہی صادق آتی ہے، صدیوں میں افلاک کی گردش دوام سے ''کوئی نہ کوئی ایسی جامع شخصیت پیدا ہو ہی جاتی ہے جو اس عام قاعدہ سے'' بالاتر ہوتی ہے اور یہی امتیاز اس صاحب کمال کے لئے عالم گیر شہرت اور ابدی نام وری کا باعث بن جاتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں سے امیر خسرو بھی تھے''۔ (۳)

فن بلاغت کے باب میں سبحۃ المرجان کا تیسرا باب ادبی محاسن بھی شمار کیا جاسکتا ہے

ادب: (نثر) ڈاکٹر زبید احمد نے ادب اور مرصع نگاری کو چھ حصوں میں تقسیم کرکے کتابوں کی تعیین کی ہے اور لکھا ہے کہ کل ۱۲ قسمیں ہیں، خطبات، ادبی منتخبات، مکاتیب، ادب لطیف اور افسانہ، انہوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ دوسری ادبیات کی طرح ان علما کو اہل زبان کی طرح عربی زبان پر کامل عبور حاصل نہ ہونے کی بنا پر انہیں دشواریاں پیش آئی ہیں، تاہم مذکورہ بالا موضوعات پر تصنیفات پائی جاتی ہیں، شاعری کے سلسلہ میں بھی ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی عربی شعرا نے شاعری اس وقت شروع کی جب عرب دنیا میں شاعری اپنی شان و شوکت کھو چکی تھی، اس لئے ان سے کسی شاہ کار کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے، وہ شعرا صرف حسین الفاظ سے کھیلنے کے سوا کچھ اور نہ کرسکے مگر دوسرے مورخین اور علما کو اس بات سے پورا اتفاق نہیں ہوسکتا ہے، ہم پہلے یہ کہتے آئے ہیں کہ ہند کے علما نے جس علم و فن پر قلم اٹھایا ہے خواہ وہ شرح و حاشیہ یا مستقل کتاب کی ترتیب ہو انہوں نے اس کا حق ادا کیا ہے اور ذہانت و مہارت کا ثبوت دیا ہے اور ان میں ایسے باکمال علما اور ارباب قلم بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اہل زبان سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، حسن صغانی، محمد بن طاہر پٹنی، فتاوی ہندیہ کے مرتبین ابوالفیض فیضی، عبدالحق دہلوی، شاہ ولی اللہ، ان کا خانوادہ، بلگرام کے عالی مرتبت فضلا، ادبا، خیرآباد کی تین نسلیں، نواب صدیق حسن خاں، مولانا عبدالحئی لکھنوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالحئی حسنی اور دور آخر کے

مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبدالرحمان مبارک پوری، مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا عبدالعزیز میمنی، مولانا محمد سورتی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا صفی الرحمان مبارک پوری جو اپنی شاہ کار تصنیف ''الرحیق المختوم'' سے عالمی شہرت کے مالک ہوئے، ان کے علاوہ عربی انشا پردازوں میں چند روشن نام مدرسوں اور یونی ورسٹیوں میں ملیں گے، جنوب کے کئی ممتاز علما و مصنفین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی جو بھی عربی تصنیفات عرب دنیا میں پہنچیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں لیکن بعض موضوعات میں مقلدانہ رنگ بھی ہے اور کچھ نئے موضوعات پر توجہ نہیں بھی دی گئی، اس کی وجہ جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان کے پیش نظر ہمیشہ دین اور دینی اقدار و اخلاقیات ہیں، علاوہ ازیں ماحول، آب و ہوا اور مرکز سے دوری بھی اس میں کارفرما رہی ہے۔

ہند میں عموماً جمعہ و عیدین کے خطبے عربی ہی میں ترتیب دیئے گئے یا برجستہ پیش کئے گئے، حضرت نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء) بزرگ ولی و عارف باللہ کے ساتھ عالم و ادیب بھی تھے، ان کے خطبات بڑے موثر ہیں، شاہ ولی اللہ اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہید کے خطبے اب تک مروج ہیں، نصاب درس کے لئے کچھ ادبی منتخبات بھی ہیں جن میں احمد بن محمد یمنی کی کتاب ''نفحۃ الیمن فی ما یزول بذکرہ الشجن'' نے بہت مقبولیت حاصل کی اور نصاب درس میں شامل رہی، مصنف یمن سے ہند آگئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوگئے تھے، کمپنی ہی نے عربی نصاب کے لئے یہ کتاب لکھوائی تھی، کتاب نثر و نظم دونوں کے پانچ ابواب پر مشتمل ہے، حکایات، امثال اور قصیدے بھی اس کی زینت ہیں، ایک قصیدہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا شامل ہے، ''ریاض الفردوس'' کے نام سے ایک انتخاب محمد حسین شاہ جہاں پوری کا ہے، سعد اللہ مراد آبادی اور نواب صدیق حسن خاں نے اس کی ستائش کی ہے، نفحۃ الیمن کے مصنف احمد یمنی نے کچھ خطوط بھی عربی میں لکھے ہیں، ایک خط شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے نام ہے، مرصع و نفیس تحریر ہے۔

ادب اور مرصع نثر میں فیضی کی ایک کتاب ''درر الکلم و سلک درر الحکم'' کے عنوان سے ہے، اس کی ایک عبارت ملاحظہ ہو جو اس دور کی عربی نویسی کا مختصر ہے:

"ھللوا و صلوا و صوموا و دوروا حول الحرام مواسمه و اکملوا مع الاحرام مراسمه وأعطوا مالا ماموراللصعلوک ، والسلام"۔

سید ابوبکر بن محسن علوی نے جو عرب تھے مگر عرصے تک ہندوستان میں قیام کیا، مقامات حریری اور بدیع الزماں کو پیش نظر رکھ کر آسان و سہل زبان میں المقامات الہندیہ لکھی، اس میں پچاس مقامے ہیں، راوی ابوالناصر، ابوالظفر ہندی کے کارنامے بیان کرتا ہے اور دونوں وہی کردار ادا کرتے ہیں جو حریری میں عیسیٰ بن ہشام اور ابوزید انجام دیتے ہیں، ادبی تصنیفات میں معروف مصنف شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب "مصدق الفضل" ہے جو دراصل قصیدہ "بانت سعاد" کی شرح ہے، حکایات کی ایک کتاب 'قصہ شکروتی' ہے جس کا مصنف بہ ظاہر مالاباری ہے کیوں کہ اس نے تحفۃ المجاہدین کے طرز پر کیرالہ میں مسلمانوں کی آمد، پرتگالیوں کے ساتھ جنگ، معجزۂ شق القمر کو کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے، "شکروتی" اس راجہ کا نام ہے جس نے یہ معجزہ دیکھا تھا۔

ادب (نظم): عربی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم سطور بالا میں ہندوستان کے ان تمام شاعروں کا ذکر کر چکے ہیں جنہوں نے عرب ممالک سے آکر یہاں قیام کیا یا تھوڑے عرصہ رہ کر واپس چلے گئے اور ان شعرا کے نام بھی دیے ہیں جو یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہے ہیں:

جو شعرا عرب ملکوں سے وابستہ رہے اور سندھ و گجرات آکر پھر واپس چلے گئے، ان میں ہارون بن موسیٰ ملتانی، ابوعطا سندھی، ابوضلع سندھی اور محمود بن شاہق جن کو "کشاجم" اور "ریحانۃ الادب" کے لقب سے یاد کیا گیا، ان کے اشعار حماسہ میں ابوتمام نے منتخب کیے ہیں، جاحظ نے بھی ان کا ذکر کیا ہے، حماسہ نے ابوعطا سندھی کے یہ شعر درج کیے ہیں:

ذکرتک والخطی یخطر بیننا   وقد نهلت منا المثقفة السمر
فو الله ما أدری وانی لصادق   أداء عرانی من حبائک أم سحر
فان کان سحرا فاعذرینی علی الهوی   وان کان داء غیره فلک العذر

ابوضلع سندھی:

لقد أنکر أصحابی وما ذالک بالأمثل   اذا ما مدح الهند وسهم الهند فی المقتل

کشاجم (محمود السندھی):

والدهر حرب الحی وسلم ذی الوجه الوقاح   وعلی ان اسعی ولیس علی ادراک النجاح

ان شاعروں کے بعد کے شعرا نے ہندوستان میں رہ کر مختلف علوم کی خدمت اور شاعری کی ہے:

سعد بن سلمان لاہوری (م ۵۱۵ھ): سعد کے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کئی دواوین کا ذکر ملتا ہے مگر دست یاب نہیں، مولانا آزاد بلگرامی نے اس کا ذکر کیا ہے، رشید الدین وطواط نے بہ طور دلیل ان کے چند اشعار لکھے ہیں:

ثق بالحسام فعهده میمون   وارکب وقل للنصر کن فیکون

دو شعر مزید پیش ہیں:

ولیل کان الشمس ضلت ممرها   ولیس لها نحو المشارق مرجع
فقلت لقلبی طال لیلی ولیس لی   من الهم منجاة وفی الصبر مفزع

حسن بن صغانی (م ۶۵۰ھ): کا ذکر پہلے متعدد بار گزر چکا ہے، محدث اور ماہر لغت تھے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

وکنت افنیت عمری فی رفاهیة
فعضبتی ولذیذ العیش انسانی
فقلت یا دهر سالمنی مسالمة
فاننی عمری ثم صاغانی

امیر خسرو (طوطی ہند-۷۲۵ھ) ممتاز ادیب و شاعر، ذکر ہو چکا ہے: شعر ملاحظہ ہو:

ذاب الفؤاد وسال من عینی الدم
وحکی الدوامع کل ما أنا اکتم
یا عاذل العشاق دعنی باکیا
ان السکون علی المحب محرم

شیخ نصیر الدین محمود (چراغ دہلوی-م ۷۵۷ھ) حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ

اور ممتاز صوفی و مربی: ایک شعر پیش ہے جوانہوں نے اپنے استاذ کی تعریف میں کہا ہے:

سالت العلم من احياك حقا

فقال العلم : شمس الدين يحى

قاضی عبدالمقتدر دہلوی (م ۷۹۱ھ): مسعود سلمان اور امیر خسرو کے بعد اہم شاعر ہیں: ان کا رسول اللہ ﷺ کی مدح ونعت میں مشہور قصیدہ ہے جوانہوں نے طغرائی (م ۵۱۵ھ) کے لامیۃ العجم کا معارضہ کرتے ہوئے نظم کیا، دوشعر پیش ہیں:

يا طالب العز فى العقبى بلا عمل

هل تنفعك فيها كثرة العمل

يا من تطاول فى البنيان معتمدا

على القصور و خفض العيش والطول

اقنع من العيش بالأدنى وكن ملكا

ان القناعة كنز عنك لم يزل

مولانا احمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ): نعت نبی ﷺ سے متعلق ان کا قصیدہ دالیہ) مشہور ہوا، اپنے استاذ عبدالمقتدر کی پیروی میں یہ قصیدہ کہا:

خل الأحاديث عن ليلى و جارتها

وارحل الى السيد المختار من أدد

وليس فى الدين و الدنيا و آخرتى

سوى جناب رسول الله معتمدى

يا افضل الناس من ماض و مؤتنف

و أكرم الخلق من حر و من عبد

افديك بالروح والقلب المشوق معا

و النفس و المال و الاهل والولد

شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ کئی بار آچکا ہے، وہ

قادرالکلام پرگوشاعر بھی تھے، ان کا دیوان (اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم) مشہور ہے، ان کے دوصاحب زادے شاہ عبدالعزیز وشاہ عبدالقادر بھی علم وفضل کے ساتھ اچھے شاعر تھے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ابن خلدون کی طرح عربی نثر وشعر کوصنعت، سجع اور تکلف و ایہام سے قدیم عربیت، سلاست روانی اور فنی نثر ونظم کولوٹانے اور اس کی اصل شکل دینے میں پیشوائی اور رہبری کا کردار انجام دیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اذا كان قلب المرء فى الأمر حائر

فاضيق من تسعين رحب السبائب

وتشغلنى عنى وعن كل راحتى

مصائب تقفو مثلها فى المصائب

شاہ صاحب کے قصیدہ (اطیب النغم) سے دوشعر پیش ہیں:

يا أحمد المختار يا زين الورى

يا خاتما للرسول ما أعلاكا

يا كاشف الضراء من مستنجد

يا منجيا من الحشر والاكا

اس کے بعد ارشاد ہے:

اذا ما أتتنى أزمة مدلهمة

تحيط بنفسى من جميع جوانب

تطلبت هل من ناصر او مساعد

الوذ به من سوء العواقب

فلست ارى الا الحبيب محمدا

رسول اله الخلق جم المناقب

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ): دہلی کے بعد شمالی ہند کے جو قصبے اور شہر علما، فضلا، اولیا اور ادبا وشعرا کے مستقر ومرکز بنے، ان میں قصبہ بلگرام نے بڑی شہرت حاصل کی اور بڑے نام ور وممتاز شاعر وادیب پیدا کئے، ان میں مولانا غلام علی آزاد کا نام سرفہرست ہے، انہیں

ہندوستان سے بڑی محبت تھی، ان کی کتاب (سبحۃ المرجان) گواہ ہے، ان کے سات دیوان (سبع سیارہ) کے نام سے ہیں، بعض مورخین نے دس بھی لکھے ہیں، ان کے علاوہ بھی قصائد ہیں، ہندوستانی شعرا میں ان کا امتیاز ہے کہ قدیم شعرا خصوصاً جاہلی دور کی اتباع میں کھنڈرات، گذرگاہوں، محبوباؤں کے خیمہ زن ہونے کی جگہوں پر ٹھہر کر نہ تو بین و ماتم کیا اور نہ آنسو بہائے، غزل کہی، (مرآۃ الجمال) کے عنوان سے قصیدہ بھی کہا جس میں عورت کے حسن و جمال اور اس کے اعضاو جوارح کی تصویرکشی و پیکرتراشی کی مگر اس میں تجدید و ابتکار، تخلیق و اختراع ہے، نواب سید صدیق حسن خاں نے اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: (وله فی التغزل طور خاص فلما یوجد فی کلام غیره یعرفه اصحاب الفن)۔(۴)

استاذ عبدالمقصود شلقامی (مجلّہ ازہر مصر) مولانا بلگرامی کے بارے میں رقم طراز ہیں: (اذا قارنا شعرا زاد بغيره من معاصريه، العصر التركي، وجدنا انه القمة لا يكاد شاعر من معاصريه ان يسمو اليه) نیز لکھا ہے (لقد کان شاعرنا فحلا رائدا من طراز البارودی) ان کے اشعار کا موازنہ معاصر شعرا سے کیا جائے تو اندازا ہوتا ہے وہ شاعری کے اعلاترین بلندی پر ہیں، انہوں نے مزید لکھا ہے، مولانا عظیم جدت پسند شاعر تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ مصر کے مجدد طرز نو کے اولین شاعر محمود سامی بارودی تھے، بارودی جدید عربی شاعری کے رہنما و پیش رو شاعر ہیں، مولانا غلام علی آزاد شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی خانوادہ کے فیض یافتہ تھے جس طرح نثر و نظم اور دیگر علوم میں اس خانوادہ نے قدیم عربی ادبیات کو نیا رخ اور طرز نو عطا کیا اور کلاسیکل عربی نے نیا جامہ زیب تن کرنا شروع کیا، اسی طرح مولانا آزاد نے عربی شاعری کو نئے انداز اور جدید ڈھنگ و اسلوب عطا کر دیا جو فطری طور سے ادب کی ارتقائی شکل ہے، نمونہ کے طور پر چند شعر پیش ہیں، ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ان کی نعت گوئی اور نبی اکرم ﷺ سے محبت و شیفتگی کی بنا پر انہیں (حسان الہند) کا خطاب دیا گیا:

شان المحب عجيب فی صبابته
الهجر يقتله والوصل يحييه
لولاه ما شاقه عرف الصبا سحرا
ولم يكن بارق الظلماء يشجيه

يا جارة هيجت بالنصح لوعته
بحق مقلته العبرا يخليه

مولانا غلام علی آزاد نے نزول آدمؑ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ (نور محمدی) ان کی پیشانی پر جگمگا رہا تھا، اس کے بارے میں تین شعر کہے ہیں:

قد اودع الخلاق آدم نوره
متلألأ كالكوكب الوقاد
والهند مهبط جدنا ومقامه
قول صحيح جيد الاسناد
فسواد أرض الهند ضاء بداية
من نور احمد خيرة الأمجد

علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸) خیرآباد کے اس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے جن کی کم از کم تین نسلیں (باپ فضل امام، بیٹا فضل حق، پوتا عبدالحق) عربی ادبیات کے مسند مستند پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے فیوض سے وطن عزیز کو گل و گلزار بنا، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے مجرم کے طور پر علامہ فضل حق کو جلاوطنی کی سزا ملی اور انڈمان میں بھی ایک عرصہ تک فیض پہنچا کر وہاں ہی ۱۸۶۱ء میں وفات پائی اور اسی خاک شور میں دفن کئے گئے، علامہ سے متعلق اسی جامعہ عثمانیہ کے شعبہ عربی کی فاضل پروفیسر ڈاکٹر قمر النساء صاحبہ نے (علامہ فضل حق الخیرآبادی: مع تحقیق کتاب الثورة الهندية وحياته وآثاره) کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور رسالہ کتاب کی شکل میں لاہور سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا، علامہ سے متعلق جامع اور عالمانہ کتاب ہے، بہ طور نمونہ چند اشعار پیش ہیں، مشہور قصیدہ میمیہ میں فرماتے ہیں:

فؤادی هائم والدمع هام
وسهدی دائم والجفن دام
فقلب ما فتی بجوی ولوع
ولوع فی اضطراب واضطرام
وطرف ارمد يؤذيه غمض

ولیل سرمد ساجی الظلام

طویل لا یقاس بہ زمان

فساعتہ کشہر بل کعام

مولانا فیض الحسن سہارن پوری (۱۳۰۷ھ) عربی زبان کے ممتاز عالم، ادیب اور شاعر تھے، ہندوستان کے دور اول سے ہٹ کر دربار سرکار کی شاعری کو نظر انداز کر کے اپنے مذکورہ بالا دونوں شاعروں کی طرح طرز نو اور اسلب جدید اختیار کیا، مولانا عبدالحئی حسنی ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

ذہانت فہم وفراست وعلم میں عجوبۂ روزگار تھے (نحو، لغت، اشعار اور وقائع و معارک عرب سے واقف کار تھے، ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا، فنون ادب کے سربراہ تھے (۵)، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترحم غداة العرض والعرض قائم

اذا حق أني وارد شر مورد

نسيت وانساني شبابي وشرتي

حسابي وعرضي يوم بعثي وموعدي

مولانا حمید الدین فراہی (۱۳۴۹ھ) مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور علامہ شبلی کے فیض یافتہ تھے، ممتاز مفسر، علوم قرآن وادبیات کے جلیل القدر عالم، ادیب وشاعر تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ کے بانی، مربی، مصنف اور مقبول استاذ ومفکر تھے، ان کے متعلق کئی پی ایچ ڈی کے رسالے اور تحقیقی کتابیں لکھی گئی ہیں، جنگ طرابلس کی مناسبت سے یہ اشعار کہے:

كيف القرار وقد نكس

اعلامنا بطرابلس

كيف القرار وحولنا

الاعداء ترتقب الخلس

يبغون قسطنطنيه

وبعدها أرض القدس

نبكي على اخواننا

بين القتيل ومن حبس

هم اهلنا وعشيرتنا

افيألمون ولا نحس

مفتی محمد عباس لکھنوی (۱۲۲۴ھ) لکھنؤ ہی میں تعلیم حاصل کی، مدرسہ سلطانیہ میں مدرس رہے اور ایک مدت تک نواب اودھ کی وزارت میں بھی کام کیا، چند اشعار پیش ہیں:

هو الله لا يحصى عليه ثناء

ويعجز عن ادراكه العرفاء

عليم حكيم صانع متقدس

يصور في الارحام كيف يشاء

الهي فخلص نيتي فيك حيث

لا يكون مرادي سمعة ورياء

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۱۲۴۷ھ-۱۳۳۱ھ) دیوبند میں پیدا ہوئے، وہاں ہی تعلیم ہوئی، مزید تعلیم کے لئے دہلی کا سفر کیا اور مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے اعلا تعلیم حاصل کی، علوم عربیہ میں مہارت حاصل کی، شعری ذوق اچھا تھا، دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دی اور دار العلوم دیوبند کے قائم کرنے میں شریک رہے ۱۸۶۶ء، شعر کے نمونے:

يا قاسي القلب يا من لح في عذلي

اليك عني فانني عنك في شغلي

وكيف تعرف حال المستهام أيا

من لم تصبه سهام الاعين النجل

تشبیب وغزل کے بعد سلطان عبدالحمید ثانی کی مدح کے اشعار ہیں:

عبد الحميد امان الخائفين

مبيد الظالمين سدى القول والعمل

كهف الانام مغيث المستضام له

الی اقاصی المعالی اقرب السبل

یہ ۵۳؍اشعار پر مشتمل قصیدہ ہے، قصیدہ بردہ کی شرح بھی ہے لکھی مولانا انور شاہ کشمیری: (۱۲۹۲ھ، ۱۸۷۵ء) کشمیر کے وادی لولاب میں پیدائش ہوئی، کشمیر کے دینی وعلمی گھرانہ سے تعلق تھا، بچپن ہی سے ذہانت، فراست اور قوت حافظہ کا اندازہ ہوگیا تھا، مقامی مدرسہ میں تعلیم کی ابتدا ہوئی، اس کے بعد پنجاب میں ہزارہ کے مدرسہ میں عربی ودینی تعلیم حاصل کی، امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے، دارالعلوم دیوبند کے بارے میں معلوم ہوا تو داخلہ لے کر تعلیم مکمل کی، ان کے اساتذہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن تھا، جن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے، ان کی وفات پر مرثیہ کہا، حدیث نبوی ان کا محبوب موضوع تھا، اس میں کمال پیدا کیا اور عالمی شہرت حاصل کی، متعدد عربی کتابیں تحریر کیں، ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۳ء میں وفات پائی، قادر الکلام اور برجستہ گو شاعر تھے، نعت نبی ﷺ میں ۴۷؍شعر کا قصیدہ ہے، قدیم شعرا کی طرح آغاز تشبیب و غزل سے ہے، اس کے بعد نعت کے شعر ہیں:

شمس الضحی بدر الدجی صدر العلی
علم الهدی هو قدوة للقادی
مولی الوری و بشیرهم و شفیعهم
و خطیبهم فی مشهد الاشهاد
خیر الوری بیتا و أخیر محتدا
و نبیهم من معدن منطاد
ختم النبوة والرسالة انها
بدئت به ختمت به لمعاد

نعت ومدح کے علاوہ دوسرے موضوعات سے متعلق بھی نظمیں اور قصیدے ہیں، جمعیۃ العلما کے اجلاس گیا کے موقع پر برجستہ نظم پڑھی، نواب سید صدیق حسن خاں (۱۲۴۸ھ/ ۱۳۰۷ھ) (۱۸۳۲ء/ ۱۸۹۰ء)، گذشتہ صفحات میں ان کا ذکر آچکا ہے، ہندوستان کے کثیر التصانیف علما میں تھے اور تینوں زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) میں کتابیں لکھیں، تینوں پر یکساں قدرت تھی، عربی تحریر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا اسلوب اختیار کیا، تکلف، مسجع اور الفاظ کی

بازی گری سے احتراز کر کے سادہ اور شگفتہ زبان اپنائی، عراق کے فاضل ادیب اور وہاں کی اکیڈمی کے سربراہ علامہ بہجت اثری کی ایک مجلس میں ہندوستانی علما کا تذکرہ آیا تو انہوں نے نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبدالحی حسنی کی عربی تحریر کی ستائش کی، نواب صاحب اور ان کے بڑے بھائی احمد حسن عرشی دونوں شاعر تھے اور انہیں عربی میں شعر گوئی کا اچھا ملکہ تھا، مولانا احمد حسن عرشی کے چند شعر پیش ہیں:

نسیم الصبا وافی سحیرا مطیبا
فقلت له اهلا و سهلا مرحبا
كأنك انفاس المسيح بحسنها
فأحييت صبا لم ينل قط مطلبا
اهل جئت من تلك الربى برسالة
فان الصبا نعم الرسول لمن صبا

مولانا عرشی نے ۱۲۷۷ھ-۱۸۶۰ء میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی، نواب سید صدیق حسن خاں عالم، مصنف اور مترجم کے پہلو بہ پہلو ادیب وشاعر بھی تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذات والاشان سے متعلق ایک طویل قصیدہ کہا ہے، چند شعر درج ہیں:

اخترت بین اماکن الغبراء
دار الکرامة بقعة الزوراء
کیف الوصول الی منازل طیبة
فیها المفتقر حصول رجاء
انی عشقت علی اقامة طابة
فمتی افوز بجنة الدنیاء
والقی رحالی فی ربوع مدینة
وادفن اکراما بقیعا معظما

بلاشبہ وہ ایک ممتاز ادیب، انشا پرداز اور طبع زاد شاعر تھے۔ (۲)

یہ اس دور کے کچھ عربی شاعروں کے اشعار کے نمونے ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور

شاعر ہیں جن کا ذکر ہم نہیں کر سکے ہیں، ان میں مولانا اعزاز علی صاحب، عبدالاول جون پوری اور اوحد الدین بلگرامی جو نہ صرف شاعر تھے بلکہ بلگرام کی تمام تر خصوصیات کے حامل تھے، ان کی عربی زبان میں ایک کتاب (سلوۃ الاحزان فی اشعار النسوان) ہے صرف خواتین کے عربی اشعار پر مشتمل ہے، شعبہ عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ریسرچ فیلو ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے اسے تحقیق و بحث کے بعد شائع کی ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ وقت سے تھوڑا پہلے ہی ہندوستان کے ان عربی شعرا کے بارے میں جو اس عصر جدید میں ہوئے ہیں یا ہیں کا تذکرہ کر کے اس فہرست کو مکمل کر دیں، مولانا عبدالرحمان کاشغری ندوی، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عربی استاذ مقرر ہوئے، کچھ عرصہ کے بعد ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے مدرسہ عالیہ میں منتقل ہوگئے، ان کے عربی دیوان کا مسودہ شبلی کتب خانہ ندوۃ العلما میں ہے مگر استفادہ ممکن نہ ہو سکا۔

دوسرے فاضل ندوی اور ماہر لسانیات مولانا محمد ناظم ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلما میں ادب عربی کے استاذ تھے، اس کے بعد جامعہ عباسیہ بہاول پور (پاکستان) کے شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، کچھ عرصہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی استاذ ادب رہے، علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات مدراس کا بلیغ عربی میں (الرسالة المحمدية) کے عنوان سے ترجمہ کیا اور بیروت سے شائع کیا، علامہ سید ندوی نے انہیں قلم عنایت کیا تو قلم کی تعریف میں نظم کہی، اس کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بچوں کی اپنی درسی کتاب (القراءة الراشدہ) میں شائع کی، اس کا ایک شعر یہ ہے:

اهدى الى سيدى
قلما رشيقا من دكن

(میرے استاذ عالی نے مجھے حیدر آباد دکن سے لا کر ایک عمدہ قلم ہدیہ کیا)۔

حوالے

(۱) ڈاکٹر زبید احمد ص ۱۳۳ (۲) ایضاً اور مجلہ الدراسات العربیۃ کشمیر یونیورسٹی، مقالہ محمد اجتبا ندوی ص ۹ (۳) رجال من التاریخ ص ۲۶۶ (۴) ڈاکٹر وحید مرزا امیر خسرو ۱۶۲ بحوالہ ڈاکٹر شمس تبریز (۵) ابجد العلوم ص ۱۲۳ (۶) نزهة الخواطر ج ۸ ص ۳۶۶

مقالات شبلی میں عربی زبان و ادب

از:- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی☆

(۲)

جس طرح علامہ شبلی نعمانی شعر العرب کی تاریخ سے علمی حلقہ کو آگاہ کرنا چاہتے تھے، اسی طرح بلاغت کی اصل حقیقت اور صحیح تصویر بھی پیش کرنے کا داعیہ بھی ان میں پیدا ہوا، چونکہ علمائے اسلام کا سارا انحصار فن شعر و بلاغت میں ارسطو کے نظریات پر تھا اور وہ قرآن کریم کی بلاغت سے بے بہرہ تھے، یہ فکر علامہ کو اس لئے تھی کہ ارسطو نے بلاغت کے اصول وضوابط یونانی شعرا کے کلام کو سامنے رکھ کر منضبط کئے تھے، اس سے اس کا اطلاق عربی شاعری پر نہیں ہو سکتا (۱)، فن بلاغت کی توضیح و تشریح کی جانب علامہ کا ذہن اپنے شاگرد مولانا حمید الدین فراہیؒ کی کتاب "جمهرة البلاغة" کے منظر عام پر آنے کے بعد مزید ہو گیا، کیوں کہ اس میں ارسطو کے بلاغت سے متعلق نظریات پر تنقید کر کے اس کے کھوکھلے پن کو واضح کیا گیا، مولانا فراہی نے بلاغت کے خدوخال قرآن کریم کی روشنی میں طے کئے، جمهرة البلاغہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ علامہ کے درج ذیل کلمات سے لگایا جا سکتا ہے "یہ تصنیف (خصوصاً اس زمانہ میں) اسلامی جماعت کے لئے اس قدر مفید اور ضروری ہے، جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جاں کے لئے آب زلال"۔(۲)

اس کتاب میں جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ارسطو کے نظریہ بلاغت کو بے بنیاد قرار دیا گیا ہے، ہیومر اور سوفاکلیس کے کلام کی بنیاد پر ارسطو نے بتایا کہ واقعہ صحیح ہو یا غلط اس کی اس طرح منظر کشی کی جائے کہ واقعہ نظروں میں گھوم جائے، یونان میں شاعری کا اصل مقصد لطف انگیزی ہے، اسی لئے ارسطو کا خیال ہے کہ راست گوئی سے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو شاعر کو حق ہے

☆ ریڈر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

کہ اس میں حک واضافہ کرے، یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے یہاں جھوٹے طلسم کے طومار کو شاعری قرار دیا گیا اور اسی اساس پر علمائے اسلام نے ''احسن الشعر اکذبہ'' کا نظریہ قائم کیا، اس کے نزدیک مصوری ہی بلاغت ہے، اسی بنا پر علمائے اسلام نے تشبیہ وتمثیل کو بلاغت کی جان قرار دیا (۳)، عبدالقاہر جرجانی نے ''اسرار البلاغہ'' میں تحریر فرمایا ہے کہ بلاغت کے مہمات مسائل تشبیہ ہی سے متفرع ہیں (۴)، اسی طرح علما نے ''استعارہ'' کو اصل بلاغت قرار دیا اور بتایا کہ بلاغت اور شاعری میں اصل لطف جھوٹ اور مبالغہ سے پیدا ہوتا ہے، مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ارسطو کے مذکورہ خیالات کو غلط قرار دیتے ہوئے بتایا کہ ارسطو کا یہ خیال حقیقت سے بعید ہے کہ تمام جانوروں کے مقابلے میں انسان میں محاکات کا مادہ زیادہ ہے کیوں کہ ایک بچہ اپنے تمام اقوال وافعال اس وجہ سے انجام دیتا ہے کہ اس کے اندر تمام انسانی خصائل بالقوہ موجود ہوتے ہیں نہ کہ محاکات کی قوت کی وجہ سے۔

علامہ فراہی کا خیال ہے کہ ایک انسان قوت نطق کی بنیاد پر دیگر تمام جانداروں سے ممتاز ہے، نطق اصلاً عقل کا آلہ ہے، اسی کے ذریعہ انسان اپنے خیالات اور نظریات کو پیش کرتا ہے، نطق کا کمال دو چیزوں سے عبارت ہے، یعنی خیالات اور مطالب صحت وخوبی سے ادا کئے جائیں۔

ارسطو کے یہاں نطق کی کوئی حیثیت نہیں، نطق کا کام بعینہٖ مضمون کی ادائیگی ہے، اسی نظریہ کی اتباع ''نقد الشعر'' میں کی گئی ہے، ابوجعفر قدامہ کا خیال ہے کہ ''اگر کسی شعر میں کوئی بے ہودہ اور لغو مطلب ادا کیا گیا ہو تو اس سے شعر کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا''۔(۵)

مولانا فراہی نے سارا زور نطق پر دیا ہے، نطق آواز اور معنی کی آمیزش کا نام ہے لیکن اصل قیمت معانی کی ہے، آواز کتنی ہی اچھی ہو اگر معانی اچھے نہ ہوں تو وہ ذہنوں میں گھر نہیں کرسکتے، کلام بلیغ اسے کہا جائے گا جو دل میں اتر جائے، دلوں میں افکار ومعانی اترتے ہیں نہ کہ الفاظ وتراکیب، شعرائے عرب کلام کی تعریف حسن معانی ہی کی بنیاد پر کرتے ہیں جیسا کہ زہیر بن ابی سلمی کہتا ہے:

وذی نعمة تممتها وشكرتها   وخصم يكاد الحق يغلب باطله
دفعت بمعروف من القول صائب   اذا ما اصقل الناطقين مفاصله

وذی خطل فی القول یحسب وانه   مصیب فما یلمم به فهو قائله
عبأت له حلما واکرمت غیره   واعرضت عنه وهو باد مقاتله (۶)

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے قرآن کریم سے استدلال کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی قول کو بلیغ قرار دیا ہے جو دل پذیر اور دل نشیں ہو، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ''قُلْ لَهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلاً بَلِيْغاً'' اس آیت میں آنحضورﷺ کو یہ تلقین کی گئی کہ اپنی بات کو اس طرح پیش کریں جو دلوں میں اتر جائے، یہی مفہوم ایک دوسری آیت میں اس طرح ہے: ''وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ''۔

علامہ فراہی نے ارسطو کے نظریات کی تردید کرتے ہوئے قرآن کریم کی روشنی میں بلاغت کا حقیقی مفہوم یہ بتایا ہے کہ کلام کی خوبی صرف محاکات کا نام نہیں، کلام کی غرض وغایت صرف سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عقل کی سفارت اور پیغامبری ہے، کلام سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ اس لئے نہیں کہ کلام ایک قسم کی محاکات ہے اور محاکات انسان کی فطرت میں داخل ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ نطق ایک قوت ہے اور ہر قوت کے استعمال میں انسان کو خواہ مخواہ مزہ آتا ہے، انسان کا اصلی خاصہ محاکات نہیں بلکہ نطق ہے، کلام کی خوبی سچائی پر موقوف ہے''۔(۷)

علامہ شبلیؒ نے ''جمہرۃ البلاغۃ'' کے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کریم کو فکری اعتبار سے بھی عظیم ترمعجزہ قرار دیا ہے، بلاغت ہی کے حوالہ سے شاعری اور خطابت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ شاعری کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر اپنے احساسات کو شعور کے ساتھ پیش کرے، شعر دراصل احساس کا نام ہے، شاعر رنج وخوشی اور غصہ واستعجاب کے احوال سے گزرتا ہے، اسی کو الفاظ کی صورت میں پیش کرتا ہے، شاعر کا احساس یک بارگی قوت متخیلہ، نطق اور آواز ولہجہ میں حرکت پیدا کردیتا ہے، ایک خطیب بھی شاعر سے کم حساس نہیں ہوتا لیکن احساسات اس پر حاوی نہیں ہوتے کیوں کہ وہ موقع ومحل کی مناسبت سے احساسات کو چھیڑتا ہے، اسی بنا پر ایک خطیب شاعر کے بالمقابل زیادہ باشعور اور ذکی النفس ہوتا ہے، اہل عرب نے شعر کو حکمت اور خطبہ کو جادو سے تعبیر کیا، مولانا فراہیؒ نے شاعر کو سریع الانفعال اور طبعاً موسیقی پسند قرار دیا ہے۔

اس موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے ارسطو کے اس خیال پر تنقید کی ہے کہ انسان اپنی دلی کیفیات کی تصویر محاکات کے ذریعہ پیش کرتا ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ جذبات انسانی دل کے اندر ایک پر جوش حرکت پیدا کرتے ہیں اور یہی حرکت مختلف شکلیں آواز، راگ، رقص اور آنسو کی دھار لیتی ہے، یہ حرکات نفسانی الفاظ کے مانند ہیں جو مفاہیم پر دلالت کرتے ہیں نطق کی طرح یہ حرکات بھی فطری نہیں۔ (۸)

جمہرۃ البلاغہ میں جس انداز سے ارسطو کے نظریات بلاغت کو بے بنیاد بتایا گیا ہے اور قرآن کریم کی روشنی میں بلاغت کی ایک مستحکم عمارت تعمیر کی گئی ہے، اس کی مثال پورے عربی لٹریچر میں نہیں ملتی۔

علامہ شبلی نعمانی فن بلاغت کے مصادر ومراجع سے واقف تھے، جاحظ، محمد بن یزید واسطی، عبدالقاہر جرجانی، رمانی، خطابی، زملکانی، امام رازی، ابن سراقہ، قاضی ابوبکر باقلانی نے اس موضوع پر بسیط اور مفصل کتابیں لکھی ہیں لیکن یہ سب ناپید ہیں، علامہ کا کہنا ہے کہ اپنے سفر کے دوران میں نے قسطنطنیہ میں یہ تمام کتابیں تلاش کیں جو نہ مل سکیں، صرف باقلانی کی کتاب خدیو کے کتب خانہ میں موجود ہے، علامہ نے عبدالقاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ کی بھی بہت تعریف کی ہے کیوں کہ ان دونوں کتابوں میں جو نکتہ آفرینیاں کی گئی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں، ان کے علاوہ بھی بے شمار تصانیف ہیں جن میں انشاپردازی کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے، مثلاً ابن ابی الاصبع نے قرآن مجید کے صنائع وبدائع پر روشنی ڈالی ہے، عزالدین بن عبدالسلام نے قرآن کریم کے مجازات کو یک جا کیا، ابوالحسن ماوردی نے قرآن کریم کی امثال جمع کیں، علامہ سیوطی نے الخواطر السوانح فی اسرار القوانح کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی جس میں سورتوں کے طریق ابتدا پر بحث کی گئی اور ابن قیم نے کتاب التبیان کو ترتیب دیا جس میں اقسام قرآنی پر اظہار خیال کیا گیا (۹)، مذکورہ بالا سطور سے مترشح ہے کہ علامہ کی فصاحت وبلاغت کے رموز پر دسترس تھی۔

علامہ نے ایک مقالہ "ندوۃ العلما کا اجلاس سالانہ اور علمی نمائش گاہ" کے عنوان سے تحریر کیا جس میں ضمنی طور پر بلاغت سے متعلق چند کتب پر اپنی آرا پیش کیں، اس میں پہلے ارسطو

کی کتاب "الخطابۃ" کا ذکر کیا، جو اس موضوع پر اولین تصنیف ہے، اس کا تفصیلی ذکر جمہرۃ البلاغہ کے تعارف میں آچکا ہے اور مولانا فراہی نے اس کے محاسن ومعائب پر نہایت عالمانہ گفتگو کی ہے، اس کے بعد جاحظ کی البیان والتبیین پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ "جاحظ نے اس طرح فن کے قائم کرنے کا گویا مصالحہ مہیا کر دیا ہے"، اس کے بعد ابن قدامہ کی نقد الشعر کا ذکر کیا اور بتایا کہ "یہ کتاب گرچہ نہایت مختصر اور گویا فن بلاغت کا دیباچہ ہے لیکن حقیقی فن بلاغت کے جس قدر مسائل اس میں مل سکتے ہیں، کتب درسیہ کے ہزاروں صفحوں میں ان کا نام ونشان بھی نہیں مل سکتا"، اس کے بعد عسکری کی کتاب الصناعتین، جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ اور سکاکی کی مفتاح کا ذکر کیا اور نہایت اختصار کے ساتھ ان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی، مولانا کے ان خیالات و رجحانات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ علامہ کو فن بلاغت سے گہری مناسبت تھی جس کا اظہار ان مقالات کے علاوہ "موازنہ انیس ودبیر" سے بھی ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنے مقالات میں ہومر، متنبی، غلام علی آزاد بلگرامی کی شخصیت وشاعری پر مختصراً رائے زنی کی ہے لیکن اسے غور سے پڑھا جائے تو یہ ضرور کہا جائے گا کہ یہ آرا علامہ کے عمیق تفکر وتدبر کا نتیجہ ہیں، مقالات شبلی کے متعدد مقالات میں یہ شواہد بہ کثرت موجود ہیں کہ علامہ کی عربی ادب پر گہری نظر تھی۔

ہومر کی الیڈ: ہومر کو علامہ نے دنیا کا عظیم ترین شاعر قرار دیا ہے اس کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ ارسطو نے اس کے مشکل اشعار کی شرح میں ایک کتاب لکھی، فن شاعری اور بلاغت کے سارے اصول ارسطو نے ہومر ہی کے کلام سے منضبط کئے، سکندر سفر وحضر میں ہمیشہ ہومر کا کلام ساتھ رکھتا تھا، رینان کا قول ہے کہ "ایک ہزار سال کے بعد دنیا کی تمام تصنیفات مٹ جائیں گی صرف ہومر رہ جائے گا"۔

اصلاً علامہ نے یہ مضمون ہومر کے الیڈ کے ترجمہ کے باب میں تحریر کیا ہے، ایک عرصہ تک اس کا ترجمہ عربی میں شاید اس لئے نہیں ہوا کہ عرب اپنی شاعری کے مقابلے میں دنیا کی تمام شاعری کو کم تر تصور کرتے تھے، ایک مدت کے بعد پروفیسر سلیمان البستانی نے اسے عربی قالب میں پیش کیا، پروفیسر صاحب کا شام کے مشہور اہل علم میں شمار ہوتا ہے (۱۰)، عربی زبان

میں ترتیب دی جانے والی انسائیکلوپیڈیا کے پیچھے اسی عظیم شخص کی کاوشیں شامل ہیں۔

الیڈ کے ترجمہ میں خاص بات یہ ہے کہ بستانی نے جگہ جگہ ہومر کے کلام میں بلاغت کا جو پہلو ہے اسے حاشیہ میں نمایاں کیا ہے اور اکثر عربی اشعار سے اس کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے (۱۱)، جاہلی شعرا کے بہت سے مضامین ہومر کے خیالات سے حددرجہ ہم آہنگ ہیں اور اس مقارنہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جاہلی شعرا نے ہومر کے خیالات سے سرقہ کیا ہے لیکن یہ اس لئے ممکن نہیں کہ وہ یونانی زبان سے واقف نہ تھے اور سرقہ عرب شعرا کے مذاق کے خلاف تھا۔(۱۲)

متنبی: علامہ نے متنبی کے مختلف اصول کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے، متنبی گرچہ چوتھی صدی کا شاعر تھا، اس عرصہ میں عرب شعرا کے اوصاف تبدیل چکے تھے لیکن چوں کہ اس کی پرورش صحرائے عرب اور بدویوں کے مابین ہوئی تھی، اس لئے جاہلی شاعری کے بہت سے امتیازات اس کے یہاں موجود ہیں، اپنے آپ کو تمام شعرا سے برتر تصور کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نبوت کا دعوی کر بیٹھا اور اپنی شاعری کو معجزہ قرار دیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں ایک کتاب لکھی تھی۔

اس مضمون میں علامہ نے متنبی کے مختلف واقعات بیان کئے ہیں، مثلاً سیف الدولہ کے دربار سے کسطرح وابستہ ہوا اور ابوالعشائر کے توسط سے کس طرح اعزاز واکرام حاصل کیا، اسی طرح مصر جاکر کافور سے وابستہ ہوکر اس کی شان میں مدحیہ قصائد پیش کئے اور اس نے اسے گراں بہا صلے دیئے لیکن اس سے اسے تشفی نہیں ہوسکتی تھی کیوں کہ خود کو کسی صوبہ یا ضلع کے حاکم کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا جیسا کہ درج ذیل اشعار سے واضح ہے:

فارم بی ما اردت منی فانی   اسد القلب ادمی الـدواء

جو خدمت چاہے میرے سپرد کردے کیوں کہ میں آدمی کی صورت میں شیر ہوں۔

فوادی من الملوک وان کا   ن لسانی یری من الشعراء (۱۳)

میرا دل بادشاہوں کا دل ہے گو میری زبان شاعروں کی ہے

کافور کے تحفے وتحائف جب متنبی کی خواہشات پوری نہ کرسکے تو متنبی نے اس کی ہجو لکھی:

صار الخفی امام الآبقین بها   فالحر مستعبد و العبد معبود

یہاں ایک خواجہ سرا فراری غلاموں کا امام ہے آزاد غلام بن گئے ہیں اور غلام معبود بن گیا ہے۔

ماکنت احسبنی البقی الی زمن   یسیئی بی فیه کلب وهو محمود (۱۴)

میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسا زمانہ دیکھوں گا جس میں ایک کتا مجھ کو ستائے اور پھر مجھے اس کی تعریف کرنی پڑے۔

کافور کی ہجو کہنے کے بعد اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کوفہ پہنچا اور وہاں سے بغداد مہلبی کے دربار میں حاضر ہوا لیکن اس درجہ کے لوگوں کی مدح سرائی اپنے لئے باعث عار تصور کرتا تھا، اس پر مہلبی نے اپنے درباری شعرا سے اس کی ہجو بیان کرنے کو کہا تو انہوں نے ہجو کی طومار لگادی، لوگوں نے متنبی سے اس کا جواب دینے کو کہا تو اس نے کہا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں:

واذا اتتک مذمتی من ناقص   فهی الشهادة لی بانی کامل (۱۵)

اس کے بعد فارس جاکر ابن العمید کے دربار میں حاضر ہوا جو اہل علم اور انشا پرداز تھا، ابن العمید نے اس کا استقبال بڑی شان سے کیا، کچھ دیر کے بعد اس نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے دو شعر اس طرح ہیں:

من مبلغ الاعراب عنی اننی   شاهدت رسطالیس والاسکندرا

بدویوں سے یہ پیغام کون جاکر کہے گا کہ میں نے ارسطو اور سکندر دونوں کو دیکھا ہے۔

وسمعت بطلیموس دارس کتبه   متملکا متبدیا متحضراً (۱۶)

میں نے بطلیموس کو درس دیتے سنا جو فرماں روا بھی ہے، بدوی بھی ہے، شہری بھی ہے۔

اس کے بعد عضد الدولہ کی درخواست پر اس کے دربار میں حاضر ہوا جس نے ہر طرح کے قیمتی تحائف کے ساتھ اس کی بڑی توقیر کی لیکن اسے یہاں راحت نہ ملی، چنانچہ عضد الدولہ کی خدمت میں ایک وداعی قصیدہ پیش کرتے ہوئے یہاں سے بھی روانہ ہوا، راستے میں کچھ حملہ آور اس کے اوپر ٹوٹ پڑے، متنبی دیر تک ان سے لڑتا رہا لیکن تنہا اتنے لوگوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا، شکست کھاکر بھاگنا چاہا تو اس کے غلام نے کہا کہ آپ کا وہ شعر کیا ہوا:

الخیل واللیل والبیداء تعرفنی   الحرب والضرب والقرطاس والقلم (۱۷)

مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحراء، جنگ وجدل اور کاغذ وقلم سب پہچانتے ہیں۔

یہ سنتے ہی بھاگتا ہوا متنبی واپس پلٹ پڑا اور لڑ کر اپنی جان دے دی۔ (۱۸)

اس مضمون میں علامہ نے صرف اس کی زندگی کے احوال بیان کئے ہیں، اس کی شعری خصوصیات سے بحث نہیں کی ہے، پورے مضمون میں نہ تو اس کے کلام کے محاسن بیان کئے گئے ہیں اور نہ ہی اس کی شاعری کے معائب پر کہیں نقد وتبصرہ کیا ہے، اس کے انداز بیان اور لب ولہجہ کا ذکر نہیں ہے، علامہ کی تنقیدی بصیرت کا تقاضا تھا کہ متنبی کے کلام کے بنیادی نکات سامنے لائے جاتے اور اسے اپنے معاصرین میں نمایاں حیثیت کے حاصل ہونے کے اسباب بیان کئے جاتے، انہیں سوانحی خاکہ کہا جاسکتا ہے، کتاب العمدہ اور خزانۃ الارب وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی علمی حیثیت کا انکار ممکن نہیں، بالخصوص تذکرہ نویسی میں ان کا کارنامہ مسلم ہے، علامہ شبلی نے اپنے مضمون میں ان کی زندگی اور علمی خدمات کا خوب صورت تعارف کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ ان کی تصانیف پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس مضمون میں کسی قدر ان کی عربی زبان وادب سے متعلق خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، گو یہ مختصر ہے تاہم بعض بنیادی نکات کی حامل ہے۔ (۱۹)

علامہ نے سبحۃ المرجان کے حوالے سے بتایا کہ آزاد نے ایک باب باندھا ہے جس میں انہوں نے عربی زبان میں بھاشا کے خیالات اور شاعرانہ صنائع منتقل کئے ہیں، ان صنعتوں کی تعداد ۲۳ ہے، یہ ہندی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں جو عربی اور فارسی میں نہیں پائی جاتیں، بقیہ اور زبانوں میں مشترک ہیں، آزاد نے ہندی کے بحور وقوافی کا بھی عربی سے مقابلہ کیا ہے (۲۰)، سبحۃ المرجان کے دوسرے حصے میں یہ بحث ۱۲۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اسے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ عربی ادب پر آزاد کی نظر وسیع تھی، بالخصوص عربی شاعری پر انہیں دست رس حاصل تھی، سبحۃ المرجان کی علمیت کا اعتراف علامہ نے بھی کیا ہے۔

علامہ نے اسی مضمون میں آزاد کی عربی شاعری پر نہایت عادلانہ تبصرہ کیا، گوکہ نیت کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی عربی شاعر ان کے بالمقابل پیش نہیں کیا جاسکتا لیکن جہاں تک عربی زبان وادب کے معیار و محور اور شعری وصف و جمال کا سوال ہے تو آزاد کی شاعری کا میزان اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، علامہ فرماتے ہیں۔

"آزاد کا عربی و فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرۂ کمال کا داغ ہے، اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں، نہایت نادر کتب ادبیہ پر ان کی نظر ہے، لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہیں لیکن کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے، ان کو اس پر ناز ہے کہ انہوں نے عجم کے خیالات عربی زبان میں منتقل کئے ہیں لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے"۔ (۲۱)

مصر کے جدید ادبا و شعرا سے علامہ کے براہ راست تعلقات تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ جدید مصری ادب سے اہل ہند کو علامہ ہی نے روشناس کرایا، اسی سلسلے کا ایک مضمون فرید وجدی پر ہے (۲۲)، فرید وجدی اسلام پسند ادیب اور فلسفی تھا، اس نے اسلام کے فلسفیانہ مزاج کو علمی انداز میں ارباب فکر بالخصوص مستشرقین کے سامنے پیش کیا، فرید وجدی کے تحقیقی انداز کو اسلام پسند حلقوں میں سراہا گیا اور ان کی کتابوں کے متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے، مضمون کی ابتدا میں فرید وجدی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، انہوں نے قاسم امین کی کتاب کے جواب میں "المرأة المسلمة" (۲۳) لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ قرآن وحدیث کے علوم پر ان کی گہری نظر تھی، اس کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے اردو میں منتقل کیا (۲۴)، ۱۸۹۸ء میں مذہب اور تمدن کی مطابقت پر "تطبيق الديانة الاسلامية على نواميس الطبيعة" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جسے علمی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، یہ اصلاً فرانسیسی زبان میں تھی، اس کے علاوہ الفلسفة الحقة فى بدائع الاكوان، الحديقة الفكرية فى اثبات الله بالبراهين الطبيعية، الاسلام فى عصر العلم، سفير الاسلام الى سائر الاقوام، كنز العلوم واللغة اور صفوة الفرقان فى تفسير القرآن وغیرہ پر نظر ڈالنے سے مترشح ہوتا ہے کہ فرید وجدی نے اسلام کے حقائق کا دقیق النظری سے مطالعہ کیا تھا اور اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے جدید انداز میں انہوں نے پیش کیا، ان کی ان ہی علمی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے علامہ نے اس خواہش کا اظہار کیا، "کاش ہمارے ملک کے نوجوانوں میں کوئی فرید وجدی ہوتا"۔ (۲۵)

علامہ نے اپنے مضمون کا اختتام ان کلمات پر کیا "فرید وجدی کے کمالات کے اعتراف

کے ساتھ ہم کو کسی قدر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں، اس لئے جب وہ حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مائیگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے"، راقم کے خیال میں مولانا کا یہ خیال محتاج توضیح ہے۔

مولانا کے مذکورہ بالا کلمات کے ردعمل میں کچھ کہنے کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ مزید وجدی سے غلطی کے امکانات ہیں لیکن یہ خیال کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں، یہ وہی کہہ سکتا ہے جس نے مزید وجدی کی تمام تصانیف کا مطالعہ نہ کیا ہو، یہی بات علامہ کے متعلق کہی جائے تو شاید نامناسب نہ ہو، اسی طرح علامہ کی یہ رائے کہ قرآن کریم اور حدیث کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مائیگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے، اس بات سے بھی اتفاق ممکن نہیں کیوں کہ انہوں نے جس انداز سے اسلام کی حقانیت اور اس کے فلسفے کو پیش کیا ہے، اس کی مثال نئے ادبا کے یہاں مفقود ہے، علامہ نے اگر استدلال میں دوچار مثالیں ان کی تصانیف سے پیش کردی ہوتیں تو ان کے ان خیالات میں جان پڑ جاتی۔

مقالات شبلی کی ان تحریروں سے دو چیزیں خاص طور سے منظر عام پر آتی ہیں کہ قدیم عربی ادب کے ساتھ جدید عربی ادب پر علامہ کی گہری نظر تھی اور قدیم کی طرح نئے لٹریچر کے حصول کے لئے مضطرب رہتے تھے، ان کے زمانے کا کوئی عالم جدید عربی زبان وادب سے ان کی طرح واقف نہیں، جس وقت علامہ ان قدیم وجدید موضوعات پر اظہار خیال کررہے تھے، ہندوستان کے لئے وہ چیز بالکل نئی تھی، اس وقت مزید وجدی، مصطفیٰ کامل اور قاسم امین کے جاننے والے معدودے تھے، بالخصوص اپنے سفرنامہ میں جدید عربی ادب اور اس کی نمائندہ شخصیات کی جو خاکہ گری کی ہے وہ اس وقت بالکل اچھوتی چیز تھی اور آج تک اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، شعر العرب پر علامہ کا مضمون انفرادیت کا حامل ہے کیوں کہ جس طرز پر عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ پیش کیا گیا ہے، اس کی مثال پوری علمی دنیا میں ناممکن الحصول ہے، اس طرح کا موازنہ وہی قادر ہوسکتا ہے جو عربی ادب پر مہارت تامہ کے ساتھ شعر العجم کا مصنف بھی رہا ہو، متنبی اور مزید وجدی پر آپ کی تحریریں نہایت ہلکی ہیں، متنبی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا بلکہ متنبی سے متعلق تمام معلومات "کتاب العمدۃ" سے ماخوذ ہیں، اس کتاب میں متنبی سے متعلق بکھرے ہوئے مواد کو علامہ

نے اپنے مضمون میں سلیقے سے جمع کردیا ہے اور مزید وجدی کی خدمات پر غیر مدلل تبصرہ کیا گیا، علامہ شبلی کی قدیم وجدید عربی ادب سے متعلق خدمات اور اسلامی لٹریچر پر امعان نظر کو دیکھتے ہوئے بغیر کسی تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان میں جدید عربی ادب کے باقی تھے۔

ان کے زمانے کا کوئی عالم جدید عربی زبان وادب سے ان کی طرح واقف نہیں تھا۔

حوالے

(۱) وضاحت کے لئے دیکھیے: مقالات شبلی (باہتمام مولانا مسعود علی ندوی) طبع دوم، مطبع معارف، اعظم گڈھ ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۵۰ء، ۲/ ۱۷۔ (۲) مقالات شبلی، ۲/ ۱۴۔ (۳) جمهرة البلاغة – المعلم عبد الحميد الفراهي، الدائرة الحميدية، الهند، ۱۳۶۰ھ، ص ۶-۷۔ (۴) اسرار البلاغة – الامام عبد القاهر الجرجانی (وقف علی طبعه وعلق حواشیه: السید محمد رشید رضا) مطبع الترقی، مصر، ۱۳۱۹-۲۰ھ، ص ۶۶-۷۲۔ (۵) مقالات شبلی، ۲۔ (۶) دیوان زهیر بن ابی سلمی (تحقیق و شرح: کرم البستانی) مکتبة صادر، بیروت، ۱۹۵۳ء، ص ۹۶-۹۷۔ (۷) مقالات شبلی، ۲/ ۲۳۔ (۸) وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالات شبلی، ۲/ ۱۶-۲۸۔ (۹) وضاحت کے لئے: مقالات شبلی (باہتمام مولانا مسعود علی ندوی)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء، ۱/ ۲۹-۳۰۔ (۱۰) وضاحت کے لئے: مقالات شبلی (باہتمام مولانا مسعود علی ندوی)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء، ۱/ ۱۰۵-۱۰۶۔ (۱۱) سلیمان بستانی کی حیات وخدمات کے لئے دیکھئے: مقدمة الالیاذة، سلیمان البستانی، الطبعة الاولی، المطبعة الکاثولیکیة، بیروت ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۵-۲۰۶۔ (۱۲) اس کے لئے دیکھئے: سلیمان البستانی – الیاذه هومیروس، الطبعة الاولی، المطبعة الکاثولیکیة، بیروت ۱۹۵۵ء (ص ۵۶) دوسرا حصہ دیکھئے: سلیمان البستانی – الیاذه هومیروس (بقلم فواد افرام البستانی) الطبعة الاولی، المطبعة الکاثولیکیة، بیروت، ۱۹۵۵ء، (ص ۵۶)۔ (۱۳) وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالات شبلی (مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی) طبع سوم، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء، ۴/ ۱۸۹-۱۹۱، نیز دیکھئے: سلیمان البستانی والالیاذه – جوزف الهاشم، الطبعة الثانیة، مکتبة المدرسة و دار الکتاب اللبنانی بیروت، ایلول ۱۹۶۰ء، (ص ۲۶۲) نیز ملاحظہ کریں "سلیمان البستانی: الیاذه هومیروس۔ (۱۴) دیوان المتنبی، ص ۴۴۷۔ (۱۵) دوسرے شعر میں "ا بقی" کی

جگہ "احیا" اور "کاتب" کی جگہ "عبد" کی بھی روایت ہے، دیکھئے: دیوان المتنبی ،ص ۵۷۔ (۱۶) دیوان المتنبی ،ص ۱۸۰۔ (۱۷) ایضاً،ص ۵۲۵۔ (۱۸) ایضاً،ص ۳۳۲۔ (۱۹) وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالات شبلی (باہتمام مولانا مسعود علی ندوی) مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء، ۸۲/۵-۹۶۔ (۲۰) وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاً، ۱۲۶/۵۔ (۲۱) وضاحت کے لئے دیکھئے: سبحة المرجان فی آثار هندوستان ، السيد غلام علی البلكرامی (تحقيق : الدكتور محمد فضل الرحمان الندوی) الطبعة الاولی ، مطبعة الكوثر ، سرائے مير اعظم كره الهند ،۱۹۸۰ء، ۱/۲-۱۲۸۔ (۲۲) مقالات شبلی، ۱۲۹/۵۔ (۲۳ و ۲۴) وضاحت کے لئے دیکھئے: "المرأة المسلمة" میں ایک اسلامی عورت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے لیکن بعض امور میں روایتی انداز اپنایا گیا ہے، المرأة المسلمة – محمد فريد وجدی ، الطبعة الاولی ، مطبعة الترقی ، مصر ،۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء،ص ۱-۲۰۶۔ (۲۵) اس کا ترجمہ مولانا آزاد نے "مسلمان عورت" کے نام سے کیا ہے (فردوس پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۵ء،ص ۱۵۳۔ (۲۶) مقالات شبلی، ۱۳۸/۵۔

اخبار علمیہ

دسمبر ۲۰۰۶ء میں کویت کے عربی رسالہ "امتی" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ازروئے قواعد ولغت اور بعض لفظوں کی تصحیح شائع ہوئی ہے جو عموماً غلط طور پر مستعمل ہورہے ہیں اور یہ تصحیح مستند مآخذ پر مبنی ہے، مثلاً لا تـاخـذه فی الله لومةَ لا ئم میں لومة کی ت پر فتحہ (َ) کے بجائے ضمہ (ُ) صحیح ہے، اس کی وجہ بتائی گئی ہے کہ لومة تاخذ کا اسم فاعل ہے، للإ ستفسار میں "الف" کے نیچے ہمزہ کا رواج غلط ہے کیوں کہ وہ ہمزہ وصل ہے، حظر التِّجوال میں ت کے نیچے کے زیر غلط زبر صحیح ہوگا بروزن "تفعال" تبیان اور تلقاء وغیر الفاظ محصورہ میں داخل ہیں، حَلْويّات غلط حَلَوِيات صحیح ہے کیوں کہ اس کا مفرد (واحد) حَلْوى اور جمع سالم مونث بناتے وقت ی کے ساتھ ات کے اضافہ کے بعد حَلَوِيات ہوجائے گا، رَتْل میں ت مجزوم کے بجائے مفتوح، قَامَ بارتكاب جرائم حرب میں جرائم کی م مکسور "جرائم" صحیح ہے، علم العروض میں العروض کی "ع" پر پیش کی جگہ زبر ہوگا، ابو ظَبی میں ظبی کی ب پر زیر نہیں جزم ہوگا اور الأجرُوميّة کا صحیح املا الآجرُّوميّة ہے کیوں کہ اس لفظ کی نسبت "ابن آجرُّوم" کی جانب ہے اور آجرُّوم بربرزبان میں غریب اور فقیر کو کہتے ہیں۔

نیوز لیٹر استنبول کے مئی اور اگست کے شمارے جواب ہم کو ملا ہے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جنوبی افریقہ کی راج دھانی جوہانسبرگ میں ۱/تا۳/ستمبر ۲۰۰۶ء کو "تہذیب اسلامی" کے موضوع پر ایک عالمی سمپوزیم منعقد کیا جائے گا جو اصلاً نیشنل اوقاف فاؤنڈیشن، یونی ورسٹی آف جوہانسبرگ اور ارسکا کے باہمی تعاون سے ہوگا اور یہ مغربی افریقہ کے صدر کی سرپرستی میں ہوگا یا ہوا، OIC کے جنرل سکریٹری بھی وہاں موجود ہوں گے، اپنی نوعیت کا یہ پہلا سمپوزیم ہوگا، جس میں امریکہ، شمالی افریقہ، یورپ، یوایس اے وغیرہ ۲۰ ملکوں کے محققین کی شرکت متوقع ہے، اس کی ۲۱ نشستیں ہوں گی جن میں ۶۰/مقالے پڑھے جائیں گے، سمپوزیم کے مرکزی موضوعات میں مسلمانوں کے سیاسی وسماجی مسائل میں باہمی تعاون، ان کا ذہنی ارتقا، اقتصادی ترقیات، اسلامی تعلیم، جنوبی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اسلام اور اکنامکس وغیرہ شامل ہیں۔

فلپینی مسلمانوں نے سعودی حکومت سے شکایت کی ہے کہ اس کے اہتمام میں اسلام کی رہنما کتاب قرآن مجید کا غلط سلط ترجمہ مرانو زبان میں شائع کیا گیا ہے، میکیٹی سٹی میں واقع سعودی ایمبسی کے ترجمان کو فون سے بتایا گیا ہے کہ عرب اور وہاں کے مسلم اسکالرس کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اس طرح کی مذہبی کتابوں کے ترجمہ پر سرکاری اجازت اور تبصرہ سے پہلے پوری کتاب بالاستیعاب پڑھ لیا کرے۔

مسلم ورلڈ لیگ کے زیر اہتمام مکہ میں دو روزہ کانفرنس منعقد کی گئی، جس کا موضوع "رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا دفاع" تھا، کانفرنس میں عالم اسلام سے عقیدہ اسلام کے تحفظ اور رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں متحد ہوجانے کی اپیل کی گئی اور ایسے صلاح کار کمیشن کے قیام کی تجویز بھی زیر بحث آئی جو اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو متہم کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے، مسلم ورلڈ لیگ کے جنرل سکریٹری نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر بے جا جملہ اسلام کے تئیں ان کی دشمنی کا غماز ہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو متعارف کرانے کا ایک عالمی پروگرام تیار کیا ہے اور اس پروگرام کی تائید اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے فنڈ مہیا کرنے کی اپیل بھی کی گئی ہے۔

ارسکا کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ہلت ایرن کو کازان اسٹیٹ یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی، اس تقریب میں تاتارستان کے صدر، انٹرنیشنل افیئر کے مشیر اور دوسرے وزرا اور سرکاری عہدہ دار موجود تھے، ارسکا کے ڈائرکٹر اور یونی ورسٹی کے ذمہ داروں کے مابین ایک میٹنگ بھی ہوئی جس میں دونوں اداروں کی مشترکہ دل چسپی کی چیزوں اور موضوعات میں باہمی تعاون کے معاہدوں پر دستخط بھی ہوئے، نیز ڈائرکٹر نے رشین اسلامک یونی ورسٹی کا دورہ بھی کیا جو کازان میں قائم کی گئی ہے۔

بی بی سی وائلڈ لائف میگزین کے حوالہ سے انکشاف کیا گیا ہے کہ افریقہ میں پائے جانے والے ایک خاکی رنگ کے طوطے میں انسانوں سے مخاطب ہونے، تحریریں پڑھنے اور اظہار خیال کی صلاحیت موجود ہے، اس کا نام N' Kisi ہے، اسے ۹۵۰ لفظوں سے واقفیت ہے جن کے بہ حسن وخوبی ادا کرنے پر اسے پوری قدرت ہے، اسے سائنس دانوں نے انسانی زبان کا

سب سے زیادہ جاننے اور سمجھنے والا پرندہ تسلیم کیا، وہ انگریزی کے سو سے زیادہ لفظوں کو فعل ماضی، حال اور مستقبل کے قالب میں بھی ڈال سکتا ہے اور اپنی قوت تخیل سے کام لے کر ان کا اختراع بھی کرتا ہے اور فون پر سمجھ کر لوگوں سے تھوڑی بہت گفتگو بھی کر لیتا ہے، یونی ورسٹی آف کیمبرج اسکول آف ویٹیرنری میڈیسن کے پروفیسر کے بہ قول اس پرندے میں ادراک واخذ کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور دوسرے طوطوں کے بالمقابل لمبی چھلانگ لگانے والا ہے، بی بی سی نیوز ان لائن کی اس تجزیاتی رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ N' Kisi کی لفظ شناسی اور زود فہمی لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال رہی ہے۔

ماہنامہ "یوجنا" کی رپورٹ کے مطابق سروشکشا ابھیان کے تحت اقلیتوں کی شرح خواندگی میں بہت حد تک اضافہ ہوا ہے، یوپی میں ۰۶-۲۰۰۵ء میں ۹۹۷ رجسٹرڈ مدرسوں اور ۷۵۲ غیر منظور شدہ مدرسوں کو امداد دی گئی ہے، نیز ۰۶-۲۰۰۵ء میں غالب اقلیت والے اضلاع میں ۵۷۸ نئے پرائمری اسکول اور ۵۹۰ اپر پرائمری اسکول کھولے گئے ہیں، ۰۷-۲۰۰۶ء میں ۸۲۸ تسلیم شدہ مدرسوں کو مستحکم بنانے اور ۹۴۰ پرائمری اور ۳۲۵ اپر پرائمری اسکولوں کے قیام کی تجویز پر عمل ہو رہا ہے، ۰۵-۲۰۰۴ء میں ۳۸ء۳ لاکھ اور ۰۶-۲۰۰۵ء میں ۰۲ء۱۰ لاکھ اردو کی درسی کتابیں اور ۰۷-۲۰۰۶ء میں ایک مضمون کے طور پر اردو کی ۲۵ لاکھ درسی کتابیں تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

مدرسہ میر عرب، بخارا کی بنیاد ۱۵۳۵ء میں رکھی گئی تھی، اس وقت سے اب تک اس مدرسہ نے روس میں مسلم رہنماؤں اور داعیوں کی ایک بڑی جماعت تیار کی ہے، اس میں ۱۸ ربرس کی عمر کے طلبہ مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی کے بعد داخل ہوتے ہیں، پہلی جماعت میں داخلے کے لئے عربی قواعد سے واقفیت ضروری ہے، اس کے اخراجات مسلمانوں کے گراں قدر عطیات سے پورے کیے جاتے ہیں، اس کا شمار بخارا کے ترقی یافتہ اسکولوں میں ہوتا ہے جس کو دینی امور سے متعلق کارکنان اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی اعلا تنظیم کی سرپرستی حاصل ہے، مدرسہ سے متصل ایک میوزیم میں قرآن مجید کے مختلف مطبوعہ اڈیشن محفوظ ہیں۔ ک، ص اصلاحی

☆☆☆☆

تلخیص و تبصرہ

ایران کا قدیم تاریخی شہر - تبریز

"ایران سے شائع ہونے والے انگریزی رسالے "Mahjubah" میں "تبریز" پر ایک معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے، قارئین معارف کی دل چسپی کے لئے اس کی تلخیص شائع کی جاتی ہے"۔ ک، ص اصلاحی۔

تبریز صوبہ مشرقی آذربائیجان کی راج دھانی اور ایک تاریخی، صنعتی اور بڑا خوب صورت شہر ہے، دار السلطنت ہونے کی وجہ سے یہاں بہت سی فیکٹریاں، کارخانے اور تجارتی و صنعتی مراکز ہیں، یہ شہر سطح سمندر سے 1,340 میٹر مرتفع ہے، اس کا موسم اور آب و ہوا مرطوب ہے، یہاں سال بھر میں بارش کی اوسط 285mm ریکارڈ کی گئی ہے، چونکہ اس کی سطح بلند ہے اور یہاں بارش بھی ہوتی رہتی ہے، اسی لئے گرمیوں کا موسم بھی معتدل اور خنک رہتا ہے، تبریز کے اصل باشندے آذری زبان بولتے ہیں، آذری زبان نے ترکی زبان کی جگہ اس زمانے ہی میں لے لی تھی جب شاہان صفویہ یہاں ۱۵۰۱ء میں برسراقتدار تھے، اس علاقے میں فارسی، عربی، آرمنی اور خارجین زبانیں بولنے والے بھی پائے جاتے ہیں، ان لوگوں کے اختلاط نے تمام زبانوں کے اثرات ایک دوسرے پر پوری طرح نظر آتے ہیں، تاہم اب زیادہ تر تبریزی باشندوں کی زبان آذری ہوگئی ہے، تبریز میں اکثریت شیعہ مسلمانوں کی ہے، تھوڑی بہت تعداد عیسائیوں کی بھی ہے جو آرمینیا کے ہیں اور شہر میں رہتے ہیں۔

لفظ "تبریز" کے اشتقاق کے متعلق مورخین مختلف الخیال ہیں، بعض تاریخی کتابوں میں اس کا نام "Tauri" ملتا ہے اور اس سے بھی پہلے کی بعض تاریخی کتابوں میں "Tauriz" موجود ہے، اسیرین بادشاہ سارگون دوم کے زمانے کی ایک لوح سنگ پر "Tarouie" لکھا ہوا ہے، ایک دل چسپ چیز یہ بھی ملتی ہے کہ Tauri "Tau" اور "ri" کا مرکب ہے، Tau کے معنی آذری زبان میں گرمی یا جوش کے ہیں اور "ri" کے معنی ندی یا سوتا یا چشمہ کے ہیں، اسی لئے اس کو Tauri کہتے ہیں یعنی جوش مارنے والی ندی یا چشمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ اس شہر میں جوش مارنے والی ندیوں اور چشموں کی بہتات ہے، اسی لئے اس کو Tauri کے نام سے شہرت ملی۔

اس شہر کی ابتدا کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ پارتھین بادشاہ اردوان چہارم کے عہد میں خسرو

(Khusrow) نامی بادشاہ آرمینیا کا حکم راں تھا، اس نے اس سے متصل ایٹروپٹین (آذربائیجان) میں "Davrezh" کے نام سے ایک شہر تعمیر کرایا تھا جو مرور ایام کے ساتھ Tazi اور Azeri لفظوں کی آمیزش سے "Tavriz" بن گیا پھر "Zh" بدل کر صرف "Z" رہ گیا اور اس کے بعد Tavriz سے Tauriz یا Tabriz ہوگیا۔

تبریز کی تاریخی یادگاریں اور عمارتیں اس کی عظمت میں چار چاند لگاتی ہیں، تاہم ان میں اکثر و بیشتر بیرونی حملوں اور خود بعض حکومت وقت کی غفلتوں اور کچھ زلزلوں اور طوفانوں کی نذر ہوگئیں مگر جو دست برد زمانہ سے بچ گئی ہیں، انہیں ایلخانی، صفوی اور شاہان قاجر کے عہد کی خیال کیا جاتا ہے جو فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ ہیں، بعض کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کبود (نیلی) مسجد: شہر تبریز کی سب سے قدیم، اہم، مشہور اور قابل ذکر عمارتوں میں کبود (نیلی) مسجد ہے، اس میں اندر و باہر دونوں حصوں میں نیلی ٹائلس استعمال کی گئی ہیں اور ٹائلس پر عمدہ رنگوں سے کی گئی نقاشی اور خوب صورت اور جاذب خطاطی نے مسجد کو غیر معمولی طور پر انوکھی اور دیدنی بنادیا ہے، یہ ملکہ جہاں بیگم کے حکم سے ۱۴۶۵ء میں بنائی گئی تھی۔

علی شاہ مسجد: تبریز کی قدیم اور اہم عمارتوں میں مسجد علی شاہ کا شمار بھی ہوتا ہے یہ بھی اسلامی ایرانی فن تعمیر کا شاہ کار ہے۔

جامع مسجد: یہ یہاں کی قدیم مسجدوں میں ہے جو ایلخانی عہد کی یادگار اور مرکز توجہ ہے۔

استاد اور شاگرد مسجد: اس مسجد کے داخلی اور خارجی حصوں میں پتھروں پر عمدہ خطاطی کی گئی ہے اور یہ کارنامہ مشہور و ماہر خطاط عبد اللہ شیرافی اور اس کے شاگرد نے انجام دیا ہے، مسجد میں ایک بڑا گنبد ہے جس کی سادگی مسجد کی خوب صورتی اور کشش میں اضافہ کرتی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی مسجدیں ہیں جو اپنی شان دار تاریخ رکھتی ہیں جیسے شہزادہ مسجد، مقبرہ مسجد اور ظاہریہ مسجد وغیرہ۔

بعض معروف و مشہور ایرانی شعرا، صوفیا، علما اور سائنس دانوں کے پرکشش مقبرے بھی اہل تبریز کے عمدہ تعمیری ذوق کی غمازی کرتے ہیں، اسدی طوسی، خاقانی شیرانی، ظاہر فاریابی، قطران تبریزی، محمد شیریں مغربی، ہمام تبریزی، سلمان ساوجی، فلکی شیروانی، قاضی بیضاوی اور اس کے بعد کے دور کے مشہور شاعروں میں محمد حسین شہریار وغیرہ کے مقبرے تبریز کی ادبی، شعری اور

متصوفانہ تاریخ کے ایسے نقوش ہیں جن کے دم خم سے بزم علم وادب تابندہ تھی۔

تبریز میں ۶/قدیم چرچ بھی ہیں:

سینٹ سرکس چرچ: یہ تبریز کے اس علاقہ میں ہے جہاں آرمینین عیسائیوں کی آبادی ہے، جس کا نام Baron Avak ہے، بوسیدگی کے سبب ۱۸۷۵ء میں اس کی مرمت کرائی گئی تھی۔

سینٹ میری چرچ: اس کی تعمیر ۱۷۸۵ء میں مکمل ہوئی، یہ تبریز کا سب سے پرانا چرچ ہے۔

اسیل میری چرچ: یہ ۱۹۱۰ء میں تعمیر ہوا اور یہ تبریز کے Miar Miar علاقہ میں ہے۔

گلستاں گارڈن: یہ ایک نیشنل پارک ہے اور شہر کی سب سے نمایاں تفریح گاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے، ۵۳ ہزار اسکوائر میٹر میں محیط ہے اور تقریباً ۶۰ برس پہلے ایک قبرستان کی جگہ پر یہ پارک بنایا گیا ہے، اس سے متصل بہت سے وسیع تالاب ہیں جس کے چہار جانب پیڑ پودے اور ہریالی وشادابی ہے۔

تبریز میں ایک آذربائیجان میوزیم ہے جس کا افتتاح ۱۹۶۲ء میں کیا گیا تھا، یہ خوب صورتی ودل کشی میں کبود (نیلی) مسجد کے ہم پلہ ہے، ۳/سو اسکوائر میٹر کے رقبہ میں ہے، اس میں تین ہال ہیں، ایک تاریخی مضامین اور آرٹیکل کے لئے مخصوص ہے، دوسرے میں ایران کے متعدد قبائل کی پوشاکیں اور ملبوسات ہیں اور تیسرے میں مشہور خطاطوں کی خوش خطی کے نمونوں کے ساتھ ساتھ تصویریں، قطعے، منشور، دستاویزات اور آئینی ودستوری انقلاب سے متعلق وہاں کے سیاسی لیڈروں کے خطوط اور ذاتی مضامین ہیں جو نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں، تبریز کی دوسری قابل دید عمارتوں میں اس کی لائبریری، تومنین اسکول، طالبی اسکول، صدیقیہ اسکول، ریلوے اور بلدیاتی عمارتیں وغیرہ ہیں۔

تبریز مدت دراز سے ایک تجارتی مرکز رہا ہے، اس کی اسی اہمیت کے سبب اس کا شمار ایران کے اہم اور خوب صورت بازاروں میں ہوتا ہے، اس کا طرز تعمیر، متعدد تجارتی قافلوں کی آمد ورفت، مسجدیں اور مدرسے وغیرہ اس کے حسن وجمال اور رنگ ہائے رنگ میں مزید اضافہ کرتے ہیں مگر بازاروں کی تاریخ یا اس کے متعلق صحیح معلومات دست یاب نہیں ہیں۔

ایران کے کارپیٹ تیار کرنے والے شہروں میں تبریز کا نام سرفہرست ہے، اس صنعت کے میدان میں تبریز تقریباً ایک صدی سے اپنی شناخت بنائے ہوئے ہے، غرض ایران کی اکسپورٹ آمدنی میں تبریز کا قابل لحاظ اور خاصا اہم حصہ ہے۔

ک۔ص۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

اسلامی تصوف؟

جی-۷/۴ سفینہ اپارٹمنٹ
میڈیکل کالج روڈ
علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲
۲۳/فروری ۲۰۰۷ء

مخدوم مکرم اصلاحی صاحب — السلام علیکم

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، فروری ۲۰۰۷ کا "معارف" کا شمارہ پیش نظر ہے، خواجہ محمد سعید (پاکستان) کے مقالے کا عنوان "اسلامی تصوف" دیکھ کر خیال ہوا کہ موصوف نے "اسلامی تصوف" کی تعریف پیش کی ہوگی لیکن انہوں نے بھی تصوف کی تاریخ، اس کی تعریف اور اسلام میں اس کے داخل ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں، اس میں ہندوستان سے متعلق کچھ تاریخی غلطیاں سرایت کرگئی ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

فارسی زبان کا ایک ادنی طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اگر اسلام میں تصوف جیسی کوئی چیز ہے تو اس کی تعریف کیا ہے، کیوں کہ تصوف بجائے خود ایک علاحدہ مذہب اور عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے اور ظہور اسلام سے قبل اس کا وجود تاریخ سے ثابت ہے اور اسلام سے وہ اس کے ظہور سے دو صدیوں بعد متعارف ہوا ہے، اب اگر اس کے ماننے والے کچھ اسلامی عقائد واعمال کو بھی اپنے اندر جذب کرلیں تو کیا وہ اسلامی تصوف کہے جانے کا مستحق ہوگا، بدھ ازم، جین ازم، عیسائیت یا یہودیت جیسے مذاہب کے ماننے والے اگر کچھ اسلامی

عقائد ونظریات اور اس کے شعائر کو اپنے مذہب میں شامل کرلیں تو کیا انہیں اسلامی بدھ ازم، اسلامی جین ازم، اسلامی عیسائیت یا اسلامی یہودیت کہا جاسکے گا، آیات قرآنی اور شعائر اسلامی کے ظاہری و باطنی دو علاحدہ معانی و مطالب اور ان کی تشریح کی مدد سے تصوف کے اسلامی ہونے کا جو جواز پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ بانی اسلام اور خلفائے راشدین کے اقوال وافعال سے بھی ثابت ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ذوالنون مصریؒ، جنید بغدادیؒ، داتا گنج بخشؒ کے اقوال وافعال تصوف کے اسلامی ہونے پر کیسے حجت بن سکتے ہیں، یہ لوگ ذہنی طور پر پہلے ہی سے تصوف سے متاثر تھے، انہوں نے اسلام کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی اور تصوف کو اسلامی بنانے کی جگہ اسلام کو متصوفانہ بنادیا، میرے نزدیک تصوف بھی شیعیت ہی کی سنی شکل ہے جس طرح امامت کا مرکزی کردار حضرت علیؓ کی ذات کو بتایا گیا، تصوف کے تمام سلسلے بھی انہیں پر ختم ہوتے ہیں، یہاں تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں، میرے اس خیال کو تقویت خود ایرانی مورخین اور محققین کے بیانات سے ہوتی ہے، یہاں صرف ذبیح اللہ صفا اور نفحات الانس کے مصحح مہدی توحید پوری کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

مشہور جدید ایرانی مورخ ذبیح اللہ صفا "تاریخ ایران" کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں کہ ایرانیوں نے عربوں کے سیاسی غلبہ کی مخالفت تین طریقوں سے کی تھی، پہلی سیاسی مخالفت ابومسلم خراسانی، ابوسلمہ خلال وغیرہ کے وسیلے سے جو عہد بنوامیہ میں جاری رہی، دوسری آئین اسلام (شریعت) کی مخالفت اس میں تخریب کاری کے ذریعہ سے جو درحقیقت اسلامی حکومت کی ضد میں درحقیقت ایک منفی مقاربت تھی اور عہد بنی عباس میں پوری شدت سے جاری رہی، تیسری ادبی و اجتماعی مخالفت اس گروہ کے وسیلے سے جسے بعد میں "شعوبیہ" کا نام دیا گیا۔

مصحح "نفحات الانس" مہدی توحید پوری نے اپنے مقدمہ میں تصوف پر بڑی فاضلانہ اور پوری تفصیل سے بحث کی ہے، انہوں نے تصوف کو اسلامی تصوف کے بجائے تصوف اسلامی ایرانی لکھا ہے (اقبال بھی عجمی تصوف کہتے ہیں)، ان کا بیان ہے کہ:

"تصوف اسلامی ایرانی دارای اصالت خاصی است و فعلاً در کار در اسلام نبایستی مورد مطالعہ و تحقیق قرار گیرد، زیرا کہ اصول طریقت تصوف در بسیاری

موارد با قوانین دین مبین اسلام معارض است"۔

یعنی "تصوف اسلامی ایرانی" کی جڑ اسلام میں نہیں تلاش کی جانی چاہئے، کیوں کہ طریقت تصوف کے اصول بہت سے معاملات میں قوانین دین مبین اسلام (شریعت) سے متحارب ہیں۔

ہندوستان میں تصوف اور صوفیہ پر فاضل مقالہ نگار کی معلومات غلط فہمی پر مبنی ہیں، انہوں نے برصغیر میں اسلام کی تبلیغ میں صوفیہ کے کردار کی اہمیت کا ذکر بغیر کسی مستند حوالے کے کیا ہے، محدود مطالعہ کے باوجود میری نظر سے اب تک جتنی تاریخیں، تذکرے اور ملفوظات گزرے ہیں، ان میں صوفیا کے اسلام پھیلانے کا کوئی ایسا ذکر نہیں ملا جسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے، مسلمانوں کی فتوحات جب تک پنجاب وسندھ تک محدود رہیں، صوفیہ کی سرگرمیاں بھی انہیں علاقوں تک محدود رہیں، جوں جوں اندرون ملک مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا مفتوحہ علاقوں میں صوفیہ بھی پہنچتے رہے اور نومسلموں میں شریعت اسلامی کی جگہ سلوک وطریقت کی تبلیغ کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی مسلم آبادی میں اسلاف پرستی، قبر پرستی اور تصوف کے دوسرے رسوم پر اعتقاد رکھنے والے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ ۵۸۸ھ میں محمود غزنوی کے عہد میں نہیں سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، اس سلسلے میں میرا ایک تحقیقی مضمون "معارف" میں شائع ہوچکا ہے، ۶۳۳ھ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سن وفات نہیں ہے بلکہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قول کے مطابق خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا سن وفات ہے، خواجہ معین الدین چشتیؒ کا انتقال ۶۲۷ھ میں ہوا تھا۔

فوائد الفواد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ۱۲۲۲ء میں ملتان آئے اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ قیام کیا، اس وقت منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کررکھا تھا، بہاء الدین زکریاؒ نے انہیں رائے دی کہ دہلی چلے جائیں، چنانچہ وہ دہلی چلے گئے، اس کے کافی عرصہ بعد شیخ معین الدینؒ خواجہ بختیار کاکیؒ سے جو ان کے مرید اور خلیفہ تھے ملنے دہلی آئے تھے، اس وقت تک قطب الدین ایبک اجمیر فتح کرچکے تھے اور وہ فصیل بند شہر تھا، شاہی فوج رہتی تھی

اور مسلمانوں کی آبادی تھی، خواجہ معین الدین چشتیؒ نے حضرت بختیار کاکیؒ کو دہلی ہی چھوڑا اور خود اپنا مستقر اجمیر کو بنایا۔

چشتیہ سلسلے کو ملک گیر شہرت حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بہ دولت حاصل ہوئی تھی، خواجہ معین الدین چشتیؒ کو عوام میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت مغل عہد میں اکبر کی بہ دولت حاصل ہوئی۔

نیاز مند

محمد معتصم عباسی آزاد

مولانا شبلی کی کردار کشی

کاشانۂ ادب، سکھا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن (بہار)
۲/۲/۰۷ء

مخدوم گرامی قدر! زیدت معالیکم

امید ہے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے، نومبر ۰۶ء کے معارف میں نعت کی اشاعت پر تہِ دل سے ممنون ہوں مگر اس کے اس شعر:

علم بردار حق، انسانیت کا رہ برِ اعظم   صدائے حق سے ہر باطل کو چونکاتا ہوا آیا

کے دوسرے مصرع میں لفظ "ہر" کے بعد "اک" کا اضافہ ہوگیا ہے، اس طرح یہ مصرع وزن سے خارج ہوگیا ہے۔

معارف دسمبر ۰۶ء میں محترمی ریاض الرحمان خاں شروانی مدظلہ کا مقالہ "علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت ـ خطوط شبلی کی روشنی میں" بہت اہم اور صحت مند انداز فکر کا حامل ہے، علامہ شبلی کے تلامذہ اور دبستان شبلی کے ارباب دانش سے قطع نظر، پروفیسر ریاض الرحمان شروانی صاحب مدظلہ جس ممتاز خانوادے کی صالح علمی روایات کے امین ہیں، اس خانوادے کے اصحاب فکر و نظر سے

زیادہ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات اور ان کے احوال و آثار سے دوسرا کون واقف ہوگا؟ شروانی صاحب مدظلہ نے خطوط شبلی کا صحیح و راست پس منظر میں جائزہ لیا ہے، اس طرح ان کا مقالہ ایک اہم علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ شبلی کے خطوط بہ نام عطیہ فیضی کو غلط معنی پہنا کر علامہ کی کردار کشی کرنے والوں نے کوئی علمی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے، بلکہ ایسی علمی بد دیانتی کا ثبوت پیش کیا ہے جسے کسی بھی مہذب سوسائٹی کا صاحب علم اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اپنے مقالہ "خدوخال اقبال - ایک مطالعہ" میں رقم طراز ہیں:

"بہ طور مصنف محمد امین زبیری (۱۸۷۳ء-۱۹۵۸ء) کا کوئی مقام ہو یا نہ ہو، موصوف مولانا شبلی کی کردار کشی کے حوالے سے ضرور شہرت رکھتے ہیں، انہوں نے عطیہ بیگم کے نام شبلی کے خطوط شائع کئے، "حیات شبلی" پر ایک زہریلا تبصرہ لکھا اور پھر "شبلی کی رنگین زندگی" شائع کی، مولانا ابوالکلام آزاد کو کانٹوں میں گھسیٹا، خامہ بہ دوش بتاتے ہیں کہ "اس بدتہذیبی پر پورے ہندوستان کے عالموں اور ادیبوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے تو یہاں تک لکھا کہ "منشی محمد امین اس کتاب کے بعد کسی مہذب سوسائٹی اور جماعت میں شریک ہونے کے لائق نہیں رہے" لیکن سب سے زیادہ دل چسپ تبصرہ سید ہاشمی فرید آبادی کا تھا، انہوں نے کہا:

منشی صاحب علامہ شبلی کے بارے میں بہت متشدد ہیں، اس لئے انہیں منشی نہیں، بالتشدید مُنشّی کہنا چاہیے"۔ (شاعر اقبال نمبر، جلد اول، ص ۳۱۲)

سطور بالا میں مولانا مناظر احسن گیلانی (وفات ۱۹۵۶ء) کے حوالے سے جو بات محمد امین زبیری کے بارے میں کہی گئی ہے، میرے خیال میں کم و بیش وہی بات شیخ محمد اکرام اور وحید قریشی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

علامہ شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے میں مولوی عبدالحق بابائے اردو (۱۸۷۰-۱۹۶۱ء) معاندین شبلی میں سب سے آگے رہے، علامہ شبلی کے ساتھ مولوی عبدالحق کا حاسدانہ و معاندانہ

انداز فکر، برصغیر کی علمی و ادبی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے، مولانا ماہر القادری مرحوم (۱۹۰۷-۱۹۷۸ء) لکھتے ہیں:

"مولوی (عبدالحق) صاحب نثر نگاری میں سرسید اور حالی کے مقلد تھے، شبلی کے علم وفضل کا بھی انہیں اعتراف تھا مگر شبلی کی شعر العجم پر تنقید کا آغاز مولوی صاحب کے "رسالہ اردو" ہی سے ہوا، منشی محمد امین زبیری نے شبلی نعمانی کی جو داستان معاشقہ چھاپی تھی، اس کو مولوی صاحب کی رضامندی حاصل تھی، شبلی پر تنقید و تعریض انہیں ناگوار نہ گزرتی تھی مگر حالی پر نقد و احتساب کو وہ کسی عنوان برداشت نہ کرتے تھے"۔ (یاد رفتگاں، حصہ دوم، ص ۳۸)

علامہ شبلی کی غزلوں کے عاشقانہ اشعار کے حوالے سے ان کے مخالفین نے ان کو حسن پرست اور ہوس ناک قرار دیا ہے، اگر معاندین شبلی کا یہ زاویۂ نگاہ درست ہے تو پھر شیخ سعدیؒ (۱۱۸۴-۱۲۹۲ء) اور خواجہ حافظ (۱۳۲۴-۱۳۸۹ء) اور اردو شعرا میں امیر مینائی (۱۸۲۹-۱۹۰۰ء) اور مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۸-۱۹۵۱ء) پر بھی تو یہی الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔

معارف جنوری ۰۷ء کے شمارے میں صفحہ ۶۷ پر حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے شعر کے بعد "کی آئینہ دار ہے" کے الفاظ چھوٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے جملہ مکمل نہیں ہوسکا ہے۔

والسلام

وارث ریاضی

ریویو

جوہر کدہ، چمن روڈ
کوپا گنج (مؤناتھ بھنجن)
۱۵؍مارچ ۲۰۰۷ء

مخدومی و مطاعی حضرت مولانا مدظلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

امید کہ مع الخیر ہوں گے۔

الحمدللہ کہ ماہنامہ معارف پابندی سے موصول ہو رہا ہے اور حسب سابق ماہ فروری ۲۰۰۷ء کا شمارہ بھی باصرہ نواز ہوا، اس میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کا مضمون "علامہ شبلی بحیثیت مدیر" وقیع اور حقائق پر مبنی ہے۔

اسی عنوان کے تعلق سے درج ذیل اقتباس بھی لائق توجہ اور قابل ذکر ہے جو ماہنامہ الندوہ کی اشاعت کے چند دیگر اغراض و مقاصد میں سے ایک یعنی "علوم وفنون اور کتب نادرۂ قدیمہ پر ریویو" کے زمرے میں آتا ہے، یہ اقتباس علامہ شبلی اور مہدی افادی کی ایک باہمی مراسلت سے ماخوذ ہے، جس میں علامہ شبلی نے مہدی افادی کو ۱۸۹۰ء کے دوران لکھے گئے ایک جوابی خط کے ذریعہ ریویو کی گوناگوں اہمیت کو کچھ اس طرح اجاگر کیا ہے کہ "ریویو کا تذکرہ آپ کے خط میں ہے وہ شاید مناسب نہ تھا گو آپ کا منشا ہو لیکن اس سے متبادر ہوتا ہے کہ ریویو گویا کتاب کا ایک قسم کا معاوضہ ہے، حالاں کہ مصنف کی بڑی پست فطرتی ہے کہ وہ ریویو لکھانے کا شائق ہو، اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھنا چاہئے لیکن ریویو کوئی آسان چیز نہیں ہے...... ریویو نگاروں کے لئے یہی بہت ہے کہ ان کی قابلیت تسلیم کی جائے نہ کہ کسی مصنف پر احسان رکھا جائے، ملک میں ایسے مضمون نگار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں جن کے ریویو سے مصنف کو خوشی ہوسکے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا اقتباس بھی پیش ہے جو مولانا آزاد کے قلم سے ہے، جب انہوں نے جولائی ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا تو ریویو سے متعلق تحریر فرمایا کہ "ابنائے عصر نے ریویو کو تقریظ و مدحت سرائی کا مرادف سمجھ لیا ہے اور جب کبھی کوئی چیز اخباروں میں ریویو کے لئے بھیجی جاتی ہے تو مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے...... ہم چاہتے ہیں کہ جس قدر کتابیں ریویو کے لئے آئیں جب تک ان پر ایک کافی نظر نہ ڈال لیں اور شناسانہ رائے دہی کے لئے مستعد نہ ہوجائیں ایک لفظ حوالۂ قلم نہ کریں، ریویو نویس درحقیقت پبلک کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں کتاب کا مطالعہ کریں اور فلاں اخبار پڑھیں، بس یہ ضروری ہے کہ یہ مشورہ پوری امانت داری اور دیانت پژوہی

کے ساتھ ہو"۔

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات کا ہم موازنہ کرتے ہیں تو مترشح ہوتا ہے کہ دونوں کے مطالب یکساں ہیں، ایک میں اختصار و جامعیت ہے تو دوسرا اسی کی تفصیل و تشریح۔

ریویو سے متعلق ان دونوں اقتباسات کے پس منظر میں پروفیسر محمود الٰہی بھی لکھتے ہیں کہ "مولانا شبلی نے جو ذمہ داریاں مہدی افادی کو اجمالاً بتائی تھیں، ان کی تفصیل مولانا آزاد نے مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کی ہیں"۔

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں کہ "مولانا شبلی نے اپنے خیالات کا اظہار اس وقت کیا تھا جب مولانا آزاد ابھی مشکل سے دو سال کے تھے اور مہدی افادی مضمون نگاری کی دنیا میں قدم رکھ رہے تھے لیکن مولانا نے ریویو کے بارے میں جن حقائق کا ذکر کیا تھا وہ الہلال کے اجرا کے وقت بھی ریویو نگاروں کے لئے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے تھے"۔

(الہلال کے تبصرے مطبوعہ ۱۹۸۸ء)

ناچیز: ابوالکلام جوہر ندوی

رکن دوامی دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔

معارف: مکتوب نگار نے الندوہ کے مقاصد کی جس دفعہ کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی تعلق رسالوں اور اخباروں میں شائع ہونے والے تبصرے اور ریویو سے نہیں ہے، مولانا شبلی نے الندوہ کے مقاصد میں علوم و فنون اور کتب نادرۂ قدیمہ پر ریویو کی بات لکھی ہے جیسا کہ خود ان کے قلم سے قدما کی متعدد اہم عربی و فارسی کتابوں پر ریویو نکلے جو مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہیں لیکن رسالوں کے تبصروں کے کالم میں بعض نئی کتابوں پر جو ریویو اور تبصرہ ہوتا ہے، الندوہ کی دفعات مقاصد سے ان کا کیا تعلق؟ مکتوب نگار کو جو اشتباہ ہوا ہے اس سے قطع نظر ان کے تحریر کردہ اقتباسات لائق توجہ ہیں کیوں کہ ان کا تعلق نئی مطبوعات پر ریویو اور تبصرے سے ہے۔

☆☆☆☆

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب سلیمانی

بہ نام مولانا محمد ظفر الدین قادری

مجھے اپنے کتب خانے کے ذخیرۂ خطوط میں علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کے تین خط ملے ہیں، یہ غیر مطبوعہ ہیں، اب یہ قارئین "معارف" کی نذر ہیں:

پہلے دو خط کے مکتوب الیہ کا مولانا ظفر الدین قادری رضویؒ (۱۸۸۰-۱۹۶۲ء) ہیں، پہلا خط آج سے اسی (۸۰) سال پہلے کا ہے، تاریخ تحریر ۱۹/ جولائی ۱۹۲۷ء ہے، اس زمانے میں دونوں بزرگوں میں واقدی (۱۳۰-۲۰۷ھ) صاحب "کتاب المغازی" کی ثقاہت و استناد کے بارے میں مکاتبات ہوئے تھے، مارگولیتھ، کولیم اور بعض مستشرقین واقدی کو ضعیف و غیر معتبر مانتے تھے، مولانا ظفر الدین، واقدی کو جو مالک ابن انس، معمر بن راشد، موسیٰ بن عقبہ اور ثوری کے شاگرد ہیں اور محمد بن سعد صاحب "طبقات کبیر" جن کے کاتب تھے، غیر معتبر نہیں مانتے تھے اور انہیں استناد کا درجہ دیتے تھے، علمائے اسلام معلومات کا ذخیرہ فراہم کرنے اور مختلف روایات کی تاریخیں متعین کرنے میں واقدی کو تاریخ کے میدان میں مسلم اور مستند تسلیم کرتے رہے، اس وقت ان دونوں علما کی تحریریں، خطوط میرے سامنے نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سید صاحب ان علما کے ہم خیال ہوں گے جو فن حدیث میں واقدی کو مسترد کرتے ہیں اور ان کی جمع کردہ روایات، اگر وہ منفرد ہوں تو ان کی روایت کو محل نظر سمجھتے ہیں۔

"واقدی اور مستشرقین" کے موضوع پر معارف میں پہلا مضمون جنوری ۱۹۲۶ء میں چھپا اور دوسرا مضمون "پھر واقدی" معارف جنوری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا، کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ سید صاحب کے اس مضمون پر مولانا نے انہیں ایک خط لکھا تھا جسے سید صاحب نے معارف کے ایک شمارے میں شذرات میں چھاپ دیا تھا اور واقدی کے متعلق انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، مولانا نے اس مضمون پر ایک طویل خط سید صاحب کو لکھا تھا، پیش نظر سید صاحب کا خط اسی کے جواب میں ہے۔

دوسرا خط ۱۷/ نومبر ۱۹۳۹ء/ ۴/ شوال ۱۳۵۸ھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانے میں عنایت اللہ مشرقی (متوفی ۱۹۶۳ء) نے "مولوی کا غلط مذہب" کے نام سے کتابچوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا، "مولوی کا غلط مذہب نمبر ۹" میں انہوں نے دعوا کیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں تمام

مساجد کا سمت قبلہ غلط ہے، اس لئے مسلمانوں کی ساری نمازیں باطل ہوئیں، مشرقی صاحب کی تصنیف کا ''تذکرہ'' اور ان کے شائع کردہ کتابچوں کا پنجاب اور دوسرے مقامات کے علما جواب لکھتے رہے لیکن یہ رسالہ چونکہ ایک علمی موضوع پر تھا جس کا تعلق علم ہیئت سے ہے، اس لئے خاموشی رہی، مولانا ظفر الدین قادری نے جو علوم ریاضی و ہیئت و توقیت میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاںؒ (۱۲۷۲-۱۳۴۰ھ) کے تلامذۂ خاص میں تھے، اس رسالے کا جواب لکھنا ضروری سمجھا اور اس کے رد میں ایک مقالہ لکھ کر سید صاحب کو بھیج دیا، سید صاحب کا گرامی نامہ اسی مضمون کی رسید میں ہے جس میں انہوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، یہ مقالہ سید صاحب نے معارف کے دو شماروں (جنوری، فروری ۱۹۴۰ء) میں ''مشرقی اور سمت قبلہ'' کے عنوان سے شائع کیا۔

سید صاحب کا تیسرا خط حافظ محمد شمس الہدیٰ ساکن محلہ پیر بہوڑ پٹنہ کے نام ہے، یہ ۹؍جنوری ۱۹۲۷ء کا تحریر کردہ ہے، بعض تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ مسئلہ رویت ہلال کے سلسلے میں ایک استفتا ہندوستان بھر کے مشہور علما کو بھیجا گیا تھا، اس سلسلے میں میں نے وہ خط دیکھا تھا جو مولانا ابوالکلام نے جواب میں لکھا تھا، ان کا جواب یہی تھا کہ میں ان علوم سے واقف نہیں، پٹنہ ہی میں ایک عالم ہیں ان سے رجوع کیجیے، یہ خط میں نے مالک رام صاحب کو پیش کر دیا تھا جو اواخر عمر میں ساہتیہ اکیڈمی کے لئے مولانا آزاد کے خطوط شائع کرنے والے تھے۔

اب قارئین کرام سید صاحبؒ کے تینوں گرامی نامے ملاحظہ فرمائیں:

مختار الدین احمد

(۱)

دار المصنفین اعظم گڈھ
نمبر ۶۲۰ ۷
۱۹۲۷ء

مولانا   دامت برکاتکم

السلام علیکم - والا نامہ کا شکریہ، اچھا ہوا کہ امام ہمام کی عبارت نقل کر دی مگر اس میں تو یہ عبارت ہے ''إذا و ثقنا الواقدی'' اس میں تو شرط کے ساتھ ہے، نہ کہ بہ طور واقعہ کے ہے، اذا و ثقنا الواقدی، پھر جھگڑا کیا، باقی جو مزید مباحث آپ نے پیدا کیے ہیں ان پر لکھنا آپ کا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کرنا اور آپ کو مزید غصہ کا موقع دینا ہے۔

تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

والسلام

سید سلیمان
۱۴؍جولائی ۲۷ء
۱۳؍محرم ۴۶ھ

مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری
مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

(۲)

اعظم گڈھ

مکرم   السلام علیکم

مقالہ عالیہ کا شکریہ، میں نے ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ لیا، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے کہ اب ایسے علما جو ریاضی و ہیئت سے دل چسپی رکھتے ہوں، شاذ و نادر رہ گئے ہیں، اب جو ہیں وہ غنیمت ہیں۔

اب یہ مضمون نئے سال کے پرچے میں یعنی دسمبر کے بعد اشاعت پائے گا۔

شروع کی تمہید جس میں مشرقی کے طنزیات نقل کئے گئے ہیں گو وہ ''نقل کفر'' کی حیثیت ہی سے کئے گئے ہوں قابل احتراز معلوم ہوتے ہیں، باقی میں حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔

اگر بسلسلۂ ذکر علمائے کرام کی ان تالیفات و رسائل کا ذکر ہوتا جو تعیین سمت قبلہ کی معرفت میں لکھے گئے ہیں تو موقع کے لحاظ سے خوب ہوتا، آپ نے بہر حال اصول تو ذکر کر ہی دیئے ہیں۔

والسلام
سید سلیمان
۴؍شوال ۱۳۵۸ھ

بخدمت جناب مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی
ظفر منزل محلہ شاہ گنج، ڈاک خانہ .... پٹنہ

(۳)

شبلی منزل اعظم گڈھ

محترمی   السلام علیکم

فتوی پہنچا، افسوس ہے کہ مجھ کو علم ہیئت سے دل چسپی نہیں اس لئے آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا، مدرسہ شمس الہدیٰ میں مولوی ظفر الدین صاحب مدرس ہیں، ان کو ان چیزوں سے ذوق ہے، ان سے مل کر دریافت کر لیجیے اور سمجھ لیجیے۔

والسلام
سید سلیمان
۹؍جنوری ۲۷ء

حافظ محمد شمس الہدیٰ
پیر بہوڑ پٹنہ

ادبیات

نعت رنگ غزل

از:- افتخار امام صدیقی☆

چاند لہجے سے ہر اک لفظ کو تارا کرنا
ان کو آتا ہے خدائی کو سنوارا کرنا

سوچتا ہوں میں انہیں اور خدا دیکھتا ہوں
کوئی سمجھے تو بہت ، میرا اشارہ کرنا

آپؐ کی ذاتِ مکمل ہی سے سیکھا ہم نے
ہم کو آتا ہے ہر اک شئے کو ہمارا کرنا

اب یہ دنیا کسی انجام کو پہنچے یارب!
ان کو دیکھوں ، انہیں دیکھوں ، وہ نظارہ کرنا

ڈوب جاؤگے اگر عشقِ محمدؐ میں تو پھر
تم کو آجائے گا دنیا سے کنارا کرنا

اور تو کچھ مری خواہش نہیں میرے آقا
اک مرا نام بھی محشر میں پکارا کرنا

لفظ مرجائیں گے اظہار کی شدت سے امام
اے خدا تو انہیں لکھنا تو سپارا کرنا

☆مدیر "شاعر"، پوسٹ باکس نمبر ۳۷۷۰، گرگاؤں، ایچ-پوسٹ آفس ممبئی، ۴۰۰۰۰۴۔

مطبوعات جدیدہ

خِتامۂ مِسک: از ابن حزم اندلسی مترجم جناب مولانا حکیم عزیز الرحمان اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، برولیا، لکھنؤ نمبر ۷۔

علی بن احمد ابن حزم کی مشہور کتابوں میں جوامع السیرۃ النبویہ بھی ہے جو نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مراجع کتب میں شمار ہوتی ہے، پانچویں صدی ہجری میں یہ کتاب لکھی گئی اور معلومات کے احاطہ کے علاوہ مورخانہ دیانت وامانت کے لحاظ سے اس کو قبولیت ملی، فاضل مترجم نے اس احساس کے ساتھ کہ گو اردو میں سیرۃ النبی ﷺ کے بعد سیرت پر لکھنے کا جواز کم ہی ہے مگر نبی کریم ﷺ کے جذبہ محبت کا تقاضا ضرور ہے کہ ذکر رسول ﷺ کسی بھی صاحب دل اہل قلم کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے، اسی احساس کے تحت انہوں نے علامہ ابن حزم کی اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا، ان کے نزدیک ایک اور وجہ ہے اور یہ واقعی اہم ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے نسب نامے کو جس تفصیل سے ابن حزم نے بیان کیا، دوسروں کے ہاں اس کا اہتمام کم ہے، ترجمہ کا عنوان عطر مشک بار سیرت سید ابرار ختامہ مسک فاضل مترجم کے پاکیزہ ادبی ذوق کا عکاس ہے، پہلے بھی ان کے کئی ترجمے آچکے ہیں، اس کتاب سے ترجمہ کے فن پر ان کی قدرت اور ظاہر ہوتی ہے۔

غالب، ماضی، حال، مستقبل: از جناب پروفیسر محمد حسن، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

جدید اردو تنقید میں اس کتاب کے فاضل مصنف کا نام اہمیت سے لیا جاتا ہے، غالبیات بھی ان کا خاص موضوع ہے، جس پر وہ وقتاً فوقتاً اد تحقیق وتنقید دیتے رہے ہیں، اس مجموعہ مضامین میں ان کی قریب ۲۲ تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے، ایک مضمون اسی عنوان سے ہے جو اس کتاب کا نام ہے اور یہ شاید اس لئے کہ باقی تمام مضامین میں یا تو عہد غالب یا ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ یا صدیوں کے عمل یا پھر غالب کے تصور حیات، ان کے صد انداز اور غالب آفرینی اور ان کی غزل کی نئی جہتوں پر کلام کیا گیا ہے، بہ قول ان کے غالب پر لکھنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں،

دیوان غالب کا آئینہ خانہ ایسا ہے کہ اس میں ہر شخص اپنا چہرہ اور اپنی شناخت تلاش کرتا ہے، اس کے باوجود ان کا یہ کہنا عجیب سا لگتا ہے کہ غالب فہمی کتابوں اور مقالوں کے باوجود ابتدائی مراحل میں ہے جن میں صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے، حالی سے اب تک کے ذخیرہ غالبیات کے متعلق یہ تاثر کہ ''ان کی تھوڑی بہت اہمیت ہے''، غالبیات کے تمام محققوں کے حق میں شاید انصاف نہیں اور یہ بھی ہے کہ اس ادعا کے بعد خود فاضل مصنف سے توقعات میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن کم از کم اس مجموعہ مضامین کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دیگر غالب شناسوں کی ان کاوشوں کے مقابلے میں جن کو فاضل مصنف نے ابتدائی مراحل سے تعبیر کیا ہے، یہ کتاب انتہائی درجات تک رسائی میں کامیاب ہوئی ہے گو بعض نکتے ضرور ہیں جو پڑھنے والے کو بصیرت کی نئی کرنوں سے آشنا کراتے ہیں، 'عہد غالب میں ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ' قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے یورپ کی مشہور نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کو بے معنی قرار دیا ہے کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر سوال ہے تو محض سماجی اور تہذیبی انقلاب و تغیر کا ہے، اس ترجمانی کے بعد بھی نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح کو قبول کرنا نا قابل فہم ہے، مضامین کے مجموعوں میں تکرار ناگزیر ہے، صاحب کتاب کو بھی اس کا اقرار ہے لیکن کتاب میں کئی جگہ جملے اور اقتباسات تک مکرر سہ کرر آگئے ہیں، یہ تکرار، ترتیب کی غلطی ہو سکتی ہے لیکن جا بجا تضاد فکر و نظر کا احساس بھی ہوتا ہے، ایک طرف تو مطلق غالبیات کے ذخیرے کو ابتدائی مراحل سے تعبیر کیا گیا، دوسری طرف یہ بھی کہ غالب ایسا تاج محل ہے، جس کے ارد گرد تنقید و تشریح کا جنگل اگ آیا ہے، جس میں زقوم ہی نہیں صندل اور گلاب کی مہکتی کیاریاں بھی ہیں، حالی، بجنوری، عرشی، قاضی، مہر اور مالک رام سے ظ انصاری تک وہ کہتے ہیں کہ کون سا اہم نقاد ہے جس نے غالب کو نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کی، اسی طرح وہابی تحریک کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے نزدیک ماضی ہی مستقبل کے لئے تریاق فراہم کرسکتا ہے اور یہ تریاق کشادہ ذہنی، آزاد خیالی، وسیع المشربی اور فکر جدید کے اختیار کرنے سے حاصل نہ ہوگا، ترجمانی کا صحیح حق نہیں ہے لیکن ان چند مقامات سے قطع نظر فاضل مصنف کے مخصوص ذہنی و فکری سانچے میں ڈھلی یہ تحریریں، غالب کے شیدائیوں کو مایوس نہیں کرتیں، صحیح کہا گیا کہ تحریر کی روانی اور فکری استدلال نے ان مضامین کو دل چسپ اور وقیع بنا دیا

ہے، یہ توقع بھی بے جا نہیں کہ اس سے غالب شناسی کی نئی راہیں بھی ہموار ہو سکتی ہیں۔

وحید العصر وحید الہ آبادی : از جناب محمد واصل عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار کراچی، پاکستان۔

آتش کے شاگرد اور اکبر الہ آبادی کے استاد کی حیثیت سے وحید الہ آبادی کا ذکر گو شعرا کے تذکروں میں ملتا ہے لیکن جو شہرت ان کو ملنا تھی اس میں کمی یقیناً رہی، انیسویں صدی کے اواسط میں ان کا شہرہ ضرور ہوا، قاضی عبدالودود کے قول کے مطابق ''ان کو جو شہرت صوبہ بہار میں حاصل ہوئی وہ کسی اور صوبے میں حاصل نہ ہو سکی''، بعد کے زمانوں میں اس بے اعتنائی کی جو بھی وجہ ہو لیکن ان کے اس شعر نے بہر حال ان کو لازوال رکھا کہ

میں نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

اور یہ شعر بھی ضرب المثل کی طرح مشہور ہوا کہ

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے — جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

ضرور تھا کہ ایسے باکمال بلکہ ان کے ایک شاگرد کے بہ قول قبلۂ اہل کمال کے حالات سے اردو کی نئی نسل واقف ہوتی، اسی احساس کے تحت ان کے خاندان کے ایک بزرگ فاضل یعنی جناب محمد واصل نے حسرت، نیاز، فراق، حکیم عبدالحئی، ثاقب کان پوری، مالک رام، ماہر القادری، نثار فاروقی جیسے مشاہیر اور بعض اور مستند اہل قلم کی تحریروں کو اس کتاب میں یک جا کر دیا، خود فاضل مرتب کی تحریر بھی اس میں شامل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مولانا وحید کا دیوان کم و بیش چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اب تک یہ شائع نہ ہو سکا، دیوان کے محفوظ رہنے کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے اور اس کا ذکر قریب ہر تحریر میں ہے کہ مولانا وحید کے گھر میں آگ لگی، مولانا اپنے دیوان کو بچانے اور نکالنے کے لئے اس آگ میں کود گئے اور خود کو تو نہ بچا سکے لیکن دیوان نذر آتش ہونے سے ضرور بچ گیا، اس کتاب میں اسی دیوان کا ایک عمدہ انتخاب حسرت موہانی کا کیا ہوا موجود ہے، فراق کے الفاظ میں ان کی شاعری، تہذیب شاعری کا سبق دیتی ہے، ان کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کی داد صاحب گل رعنا نے بھی دی ہے لیکن مصحفی نے رشتۂ تلمذ کی، ان کی روایت کو بعد کے محققین نے

سہو سے تعبیر کیا ہے، اکبر الہ آبادی ان کے خاص شاگرد تھے وہ لسان العصر تھے تو بے شبہ ان کے استاد وحید العصر ہوئے، یہ کتاب تذکرہ کے علاوہ تاریخ کا لطف دیتی ہے اور آج کے قاری کو ان کے نام اور کلام سے آشنا بھی کرتی ہے، ڈاکٹر اسلم فرخی نے بجا فرمایا کہ ہم کو جناب واصل عثمانی کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے خلوص اور لگن سے یہ ابتدائی تعارفی کام ہوگیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عہد ساز شخصیت، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں: از جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۶۸، قیمت ۱۲۰، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کے عہد ساز ہونے میں شبہ نہیں، ان کے انتقال کے بعد کتابوں اور مقالات و مضامین کا ایک سلسلہ جاری ہے جن میں ان کی زندگی، فکر و نظر اور جدوجہد پر اظہار خیال کیا گیا ہے لیکن اس کتاب کے عنوان سے ہی اس کی انفرادیت اور اہمیت ظاہر ہے یعنی یہ حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کا مطالعہ براہ راست مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں ہے اور اس کے لئے مصنف محترم سے زیادہ اور کسی کو استحقاق نہیں تھا، ان کی ساری زندگی مولانا مرحوم کے دامن شفقت کے سائے میں گزری اور وہ واقعی مولانا مرحوم کے حقیقی جانشین بلکہ مثنیٰ ہیں، کتاب چھ ابواب میں ہے اور یہ حالات زندگی، تعلیم و تربیت، علمی زندگی، تحریکوں اور اداروں، دعوتی اسفار اور تصنیفات و رسائل کو محیط ہیں، خاص بات یہ ہے کہ یہ سارے مضامین فاضل مصنف نے املا کرائے ہیں، اس کے باوجود تصنیفی سلیقہ سطر سطر سے نمایاں ہے، سادگی اور سلاست فاضل مصنف کی ہر تحریر کا جوہر ہے اور یہ اس کتاب میں پاکیزہ تر ہوگیا ہے، یہ بالکل درست ہے کہ مصنف محترم نے صرف اپنے خال معظم کا حق ہی ادا نہیں کیا، امت اسلامیہ کی بھی ایک بڑی خدمت کی ہے۔

تعلیمی جہات: از ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۳۶، قیمت ۲۰۰، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی اور علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ کے مکتبات۔

اس قابل قدر کتاب کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس میں ہائی اسکول سے نٹ تک تعلیم اور روزگار کے مروجہ تمام طریقوں کی تفصیل تو ہے ہی، ٹکنالوجی، انجینئرنگ، فورینسک سائنس،

چارٹرڈ اکاؤنٹنسی، لائبریری سائنس، ڈیجیٹل لائبریری، کمپنی سکریٹری کورس کی تمام اطلاعات و معلومات بھی فراہم کردی گئی ہیں، عالمی تجارت اور اشاعت کتب کے روزگار کے مواقع بھی بتائے گئے ہیں، چند بیرونی ممالک میں تعلیمی سہولتوں کا جائزہ بھی ہے اور ایک اہم مضمون عربی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی ضرورت پر بھی ہے، لائق مولف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے تاریخ، جغرافیہ، طب یونانی، عمرانیات، قانون اور سائنسی مضامین میں مسلمان علما کے کارنامے بھی بیان کردیے ہیں، گویا شعوری طور پر نئے علوم کی تلاش میں پرفخر ماضی سے اپنے رشتوں کی بازیافت کی تلقین ان کے مدنظر ہے، ان کی اس محنت اور اس کی افادیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہی کیا جاسکتا ہے، ان کے پیرایہ بیان کی سادگی، سلاست اور سلجھے پن کی داد سید حامد نے دی ہے، یہ سند ہی کافی ہے، دوسرے بزرگوں کی نظر میں یہ کتاب لائق مصنف کی ذہنی بیداری، دوراندیشی اور قومی دردمندی کا مظہر ہے، مصنف کی کئی کتابیں پہلے بھی طبع ہوچکی ہیں لیکن یہ کتاب ان کے نام کو باقی اور قائم رکھنے والی ہے، تعلیمی موضوعات خصوصاً عصر حاضر میں تعلیم کے زندہ مسائل پر کم از کم اردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں، مدارس اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے ہر طالب علم کے پاس اس راہ نما کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

عقیدۂ اسلامی: از جناب محمد عیسیٰ عثمانی خردوی، قدرے چھوٹی تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۲، قیمت ۶۰، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی، نمبر ۲۔

اسلامی اعمال و عقائد و شعائر، عوامی فقہی مسائل، حقوق اللہ و حقوق العباد، رسالت و صحابیت، امامت و خلافت غرض اسلامی عقائد کے ہر موضوع پر آسان ترین زبان اور مستند ترجمان کی خوبیوں سے مزین یہ کتاب واقعی حیرت انگیز ہے کہ کسی بھی درجہ کا پڑھنے والا بغیر کسی ذہنی الجھن کے اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے کے علاوہ کسی بھی شک اور تذبذب کا جواب خود بہ خود پاتا جاتا ہے، حیرت اس پر بھی ہے کہ ایسی موثر اور دل نشیں تحریر ایک ایسی شخصیت کی ہے جو بہار کے مشہور عثمانی خانوادے کے معزز رکن اور ندوہ و دیوبند و جامعہ ملیہ کے اولین طلبہ اور امارت شرعیہ کے دوراول کے بزرگوں میں ہونے کے باوجود نسبتاً کم معروف رہے اور شاید اسی وجہ سے ان کی یہ

کتاب بھی جلد طبع نہ ہوسکی، مبارک باد کے مستحق ان کے نیک نام صاحب زادے امین عثمانی ہیں، جنھوں نے اپنے والد کی اس امانت کو اہتمام سے شائع کرکے دوسروں کی رسائی کے لائق بنادیا، مصنف کے حالات پر مفتی ظفیر الدین کی تحریر بھی اثر اور معلومات دونوں سے پر ہے۔

مکاتیب سرور: مرتبہ جناب انجینئر وارث رفیع، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۲، قیمت ۱۵۰، پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ اور بدایوں کے دیگر مکتبات۔

آل احمد سرور کے علم و قلم سے ایک عالم مسحور ہے، بدایوں کی خاک سے اٹھے سرور مرحوم کے نام سے ہی بہ قول شمس الرحمان فاروقی عجب فرحت کا احساس ہوتا ہے، ان کی ہر تحریر کی سب سے بڑی خوبی دل کشی اور تاثیر ہے، اس میں ان کے خطوط بھی شامل ہیں، زیر نظر کتاب میں صرف بدایوں والوں کے نام خطوط یک جا کیے گئے ہیں، ظاہر ہے یہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے نام اور ذاتی حیثیت کے ہیں، اس کے باوجود ان کی علمی و ادبی خوبی کم نہیں ہے، بدایوں سے وطنی محبت کی شدت کے باوجود ایک جگہ شکوہ کرتے ہیں کہ ”ہمارے بدایوں میں اپنے ادیبوں اور شاعروں کی قدر نہیں ہوتی یہ بات صرف بدایوں ہی نہیں پورے یوپی میں ہے“ اس مختصر مجموعہ مکتوبات میں بدایوں والوں کے علاوہ اور اردو والوں کے لئے بھی سرور کم نہیں ہے۔

آثار و باقیات سرہرپور: از جناب فاخر جلال پور، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: تنظیم دینی تعلیم، جلال پور ضلع امبیڈکر نگر۔

شاہان شرقی سے منسوب ایک چھوٹی سی بستی کے پرفخر ماضی کی یاد بڑے اثر انگیز انداز سے شاہ داؤد سرمست قلندر، شاہ نور قلندر اور شیخ کبیر الدین عباسی کے آثار کی بازیافت، اس میں مبارک کوشش کی گئی ہے۔

ساحلوں کے شہر میں: از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڈھ۔

عروس البلاد ممبئی کی سیر کی روداد، تاثرات اور معلومات اور ادبی لطف و حلاوت کی آمیزش سے اس رسالہ کی شکل میں پڑھنے والوں کے لئے عمدہ سوغات ہے۔

ع-ص